قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

انچاسواں وعظ مسمے بہ

خیر الحیاۃ و خیر الممات

منجملہ ارشادات حکیم الامتہ حضرت مرشدی و مولائی

شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمایش جناب حاجی محمد یوسف صاحب جنرل مرچنٹ رنگون

جید برقی پریس دھلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

خیر الحیاۃ و خیر الممات

الاشتات	المستمعون	من ضبط	ممن ذکر	ماذا	لم	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	کیفیت زائد	کیا مضمون تھا	کیوں ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
[illegible]	قریب ۲۵ مستورات کا مجمع تھا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ	[illegible]	... حب مال و جاہ ... اور اس کا علاج	[illegible]	کرسی پر بیٹھ کر	۲ گھنٹہ ۳۰ منٹ	۱۲ شعبان ۱۳۴۶ھ	[illegible]

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم

س

وهم الوف حذر الموت ط فقال لهم الله موتوا ثم احیاهم ان الله لذو فضل علی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون ط وقاتلوا فی سبیل الله واعلموا ان الله سمیع علیم ط من ذا الذی یقرض الله قرضاً حسناً فیضاعفه له اضعافاً کثیرة ط والله یقبض و یبسط والیه ترجعون ط

ان آیات میں حق تعالیٰ نے ایک خاص مقصود کی تاکید کیلئے ایک قصہ بیان فرمایا ہے اس کے بعد مقصود کی تصریح اور اس کے متعلقات مذکور ہیں۔ یہ حاصل ہے ان آیات کا۔ ہرچند کہ اس وقت مجھے ایک خاص مقصود کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے اور اس کی تائید وتاکید کیلئے ان آیات کو تلاوت کیا ہے۔ مگر ان آیات میں جو مقصود بالذات ہے وہ مجھکو اختلاف غرض سے مقصود تبعاً ہے اور جو مقصود بالغیر ہے وہ اسی اختلاف غرض سے مجھے اس وقت مقصود بالذات ہے اور جیسے مقصود بالغیر کو مقصود بالذات کے ساتھ ارتباط ہوتا ہے اسی طرح مقصود بالذات کو بھی مقصود بالغیر سے ارتباط ہوتا ہے پس جس طرح مقصود بالذات کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے مقصود بالغیر کو بیان کیا جاتا ہے ایسے ہی مقصود بالغیر کے ساتھ اسی ارتباط کی وجہ سے مقصود بالذات بھی تبعاً بیان ہو سکتا ہے۔ باقی اس کا مضائقہ نہیں کہ مقصود بالذات خصوصیت دواعی کی وجہ سے مقصود بالغیر ہو جائے اور مقصود بالغیر مقصود بالذات ہو جائے چنانچہ ان آیات میں مقصود بالذات تو وقاتلوا فی سبیل الله الخ ہے اور اصل مقصود مقام تشجیع بر قتال ہے اور اس کی تائید وتاکید کیلئے سباق میں ایک قصہ امم ماضیہ کا آیت الم تر الی الذین خرجوا من دیارهم وهم الوف حذر الموت ط میں مذکور ہوا ہے۔ مگر مجھے اس وقت یہی قصہ مقصود بالذات ہے اور استطراداً مقصود مقام کا بھی بیان کر دیا جائے گا۔ پھر سیاق میں آیت من ذا الذی یقرض الله قرضاً حسناً الخ میں انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ یہ متعلقات مقصود میں سے ہے۔ کیونکہ قتال کیلئے انفاق کی ضرورت بھی ہوتی ہے دوسرے خود انفاق بھی مثل قتال کے طاعت متعدیہ ہے جس کا نفع متعدی ہے اس لئے بھی اس کو

مقصود مقام سے مناسبت ہے۔ یہ تو مقصود بیان کی تعیین تھی اور سبب داعی یہ ہے کہ اس وقت بعض امراض شدیدہ کی وجہ سے لوگ پریشان ہیں جو آجکل یہاں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ہیں بھی شدید۔ مگر نہ اس درجہ جتنا کہ اُن کو شدید سمجھ لیا ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ جس چیز سے ڈرنا چاہئے یعنی جو چیز ڈرنے کی ہے اُس سے تو نہیں ڈرتے۔ اور نہ ڈرنے کی چیز سے ڈرتے ہیں۔ ڈرنے کی چیز حق تعالیٰ کی ناراضی اور غضب ہے۔ مگر اس سے ہم بالکل بے پرواہیں چنانچہ اس وقت بھی لوگوں نے کچھ اپنی حالت کی اصلاح نہیں کی۔ جو شخص جس گناہ میں مبتلا ہے۔ اسی میں مبتلا ہے۔ اور بیماری جو درحقیقت ڈرنے کی چیز نہیں اس سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس حالت کو دیکھکر تو یوں کہنا چاہئے کہ ہم اس بیماری سے اتنا ڈرتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ سے بھی اتنا نہیں ڈرتے جیسا کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ اسی کے مناسب ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں

گر وزیر از خدا بتر سیدے   ہمچناں کز ملک ملک بودے

کہ اگر وزیر خدا تعالیٰ سے اتنا ڈرتا جتنا بادشاہ سے ڈرتا ہے تو فرشتہ ہو جاتا۔ یہاں شیخ رحمۃ اللہ نے دو شکایتیں کی ہیں۔ ایک خدا تعالیٰ سے نہ ڈرنے کی دوسرے بادشاہ سے اس قدر ڈرنے کی یعنی عقل کا مقتضا تو یہ تھا کہ خدا سے ڈرتا اور بادشاہ سے نہ ڈرتا۔ کیونکہ بادشاہ تو ایک ہم ہی جیسا آدمی ہے۔ فی الحقیقت وہ ڈرنے کی چیز نہیں مگر یہاں معاملہ برعکس ہے۔ پھر اگر خدا سے اتنا ہی ڈرتے جتنا ایک حاکم اور بادشاہ سے ڈرا کرتے ہیں تو ایک درجہ میں تساوی ہو جاتی اوسط برابر ہو جاتا۔ مگر یہاں تو یہ غضب ہے کہ خوفِ خدا کو خوفِ حاکم کے ساتھ مساوات کی بھی نسبت نہیں۔ گویا نعوذ باللہ حاکم کا خوف خوفِ خداوندی پر غالب ہے یہی حال جہالت کی وجہ سے یہاں ہو رہا ہے۔ جہل کا یہ اثر ہوا کہ بیماری سے جتنا نہ ڈرنا چاہئے تھا اتنا ہی ڈرنے لگے۔ حالانکہ بیماری ڈرنے کی چیز نہیں کیونکہ بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسباب موت میں سے ہے۔ سو اسباب موت سے کہاں تک ڈروگے اس کے تو مختلف اسباب ہیں بعض دفعہ کسی ایسے سبب سے موت آجاتی ہے جس میں سببیت بہت ہی کمزور ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ کھانا کھاتے کھاتے موت آگئی۔ بعض دفعہ پانی پینے سے پھندا لگا اور مر گئے بعض دفعہ سوتے ہوئے کسی جانور نے کاٹ لیا۔ اور ختم ہو گئے بعض دفعہ مکان گر پڑا

اور دب گئے۔ اور بعض لوگ دفعۃً بیٹھے بیٹھے مر گئے۔ جہاں بظاہر کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا مر جانے کے بعد لوگ اسباب تراشتے ہیں کہ اس کا سبب ضعفِ قلب یا انسدادِ حرکتِ قلب ہوا میں یہ نہیں کہتا کہ یہ گھڑت ہمیشہ غلط ہی ہوتی ہے لیکن میں اس کا بھی معتقد نہیں کہ یہ اسباب تراشیدہ صحیح ہی ہوتے ہیں پھر ان میں بعض تو ایسے گھڑنے والے ہیں جو مشیتِ حق ہی کے معتقد نہیں بلکہ اسباب پر ہی ہر چیز کا مدار رکھتے ہیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے تعطیلِ اسباب فی بعض الاوقات کو جا بجا ظاہر کیا ہے۔ اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جاوے تو عقلاً بھی خدا تعالیٰ کی مشیت کو مؤثر ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جس حادث کیلئے آپنے ایک دوسری شئے کو سبب مانا ہے وہ سبب بھی تو ایک حادث ہے۔ اُس کے لئے کون سبب ہوا اگر اس کے لئے آپنے تیسری چیز کو سبب بنایا ہم اس میں بھی کلام کریں گے تو اس سلسلۂ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا جائے گا۔ ورنہ تسلسل لازم آئے گا۔ اور لاتناہی کے ابطال پر متکلمین دلائل قائم کر چکے ہیں۔ اور یہ حکماء کی حماقت ہے کہ وہ اجزاءِ عالم کو حادث بالشخص اور قدیم بالنوع کہتے ہیں۔ کہ ہر ہر فرد تو حادث ہے مگر نوع قدیم ہے۔ حالانکہ وہ خود اس کے بھی قائل ہیں کہ نوع کا وجود بدون شخص کے نہیں ہو سکتا پھر جب ہر ہر شخص حادث ہے تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا۔ غرض دلائلِ عقلیہ سے بھی اور نقلیہ سے بھی مشیتِ حق کا مؤثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے۔ اور جو شخص ہر بات میں لانسلم ہی کا سبق پڑھے اس کا علاج متکلمین نے احراق بالنار بتلایا ہے۔ نیز فطرۃً بھی حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے اور ماننے کی چیز کو بھی نہ ماننا تحکم ہے۔ اور تحکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں۔ جیسے ایک مجنون پاخانہ کھا رہا تھا۔ کسی نے ملامت کی۔ تو کہا اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ وہی تو ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے داخل کیا تھا۔ اب وہ ہمارے اندر سے نکلکر برا کیوں ہو گیا۔ ذرا عقلا کسی عقلی دلیل سے اُس کا جواب دیں مگر عرف اور طبیعت سے کام نہ لیں محض عقلی دلیل سے اُس کے دعوے کو باطل کریں"۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ابطال پر وہ کوئی دلیل نہ قائم کر سکیں گے۔ مگر کیا اس سے کوئی یہ کہے گا کہ اُس مجنون کی بات صحیح ہے۔ ہرگز نہیں۔ سب یونہی کہیں گے کہ وہ نالائق پاگل ہے جو ماننے کی چیز کو بھی نہیں مانتا جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے۔ اسی طرح ہم منکر صانع کو پاگل سمجھتے ہیں

کیونکہ وہ بھی ایسی ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے ماننے پر اجماع عقلاء واتفاق مذاہب ہے اور ضرورت فطرت اس پر مزید یہ تو کامل درجہ کی دہریت ہے کہ خدا ہی کو نہ مانے اور ایک قسم کی دہریت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو تو مانے اور اس کی قدرت ومشیت کو کامل نہ مانے۔ بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ شخص خدا کا قائل ہے۔ اور محض برائے نام قائل ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے مگر پنشن یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں جیسے گھڑی کو کوک دینے والا کہ کوک بھر دینے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں۔ بلکہ اب وہ خود بخود چلتی رہے گی۔ چاہے کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو جب تک کوک بھری ہوئی ہے اس وقت تک گھڑی کو اسکی کچھ ضرورت نہیں ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کر دیا اب اسباب سے مسببات اور علل سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہے گا۔ نعوذ باللہ اس تاثیر و تأثر میں حق تعالیٰ کا کچھ اختیار نہیں وہ اسباب سے مسبب کو متخلف نہیں کر سکتے۔ بس ان لوگوں کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے بعض لوگ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ سے بچنے کیلئے کوٹ پتلون اور بوٹ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں کہ ساری ہیئت تو کفار کی سی ہے صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کے لئے قدرت واختیار تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے۔ کیونکہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی نہ ماننے کے مثل ہے مگر الزام دہریت سے بچنے کیلئے برائے نام یوں کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور ان کے قدرت واختیار کو کامل بھی مانتے ہیں جیسے عامۂ مسلمین مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے۔ چنانچہ مصائب وحوادث میں ہم اپنے قلب میں وہی ضعف پاتے ہیں۔ جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے۔ ہم نے مانا کہ طبیعت کا بھی ایک اقتضا ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی طبیعت کے اقتضاء میں اعتقاد کی وجہ سے کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو جس کی حرارت ناگوار ہو اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ تو فرق ضرور ہو جاتا ہے کہ اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی۔ اسی طرح اعتقادِ قدرتِ الٰہیہ کی برودت سے طبعی خلجان میں کچھ تو کمی ہو جانا

چاہیے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو ہے۔ مگر چونکہ ہمارا اقرار ضعیف ہے۔ اس لئے اُس فرق کا ظہور نہیں ہوا جیسے گرم پانی کے ایک مٹکے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا دیا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی تو ضرور ہوگی۔ مگر اس کا احساس نہ ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں کہ جو شے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں جس چیز پر غایت مرتب نہ ہو وہ غیر معتد بہ ہے۔ اس لئے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا معتد بہ نہیں۔ دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہ ہوگا گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آجائے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص کے قلب میں ادنیٰ ادنیٰ ذرہ ایمان بھی ہوگا وہ بھی کسی نہ کسی وقت جہنم سے نجات پالیگا مگر اس سے پہلے جو عذاب ہوگا اُسکو اختیار کرنا کونسی عقل ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس تھوڑے سے عذاب پر راضی ہیں تو یہ شخص قابل خطاب نہیں اسنے جہنم کو دیکھا نہیں اسلئے یہ جرأت ہے اگر ایک دفعہ آنکھ بھر کے جہنم کو دیکھ لے پھر نانی یاد آجائے ہمنے مانا کہ ضعیف اعتقاد سے بھی کسی وقت نجات ہو جائیگی مگر کس مصیبت کے بعد اور دنیا میں تو ساری عمر پریشانی ہی رہیگی۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے تقدیر کا مسئلہ تو جس کا حاصل تاثیر قدرت ہے اسی لئے ہم کو بتلایا ہے کہ حوادث میں ہم کو راحت ہو۔ پریشانی اور گھبراہٹ حد سے زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِيٓ أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَٰبٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَآ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَآ آتَٰكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ؕ کہ جو مصیبت بھی پہنچتی ہے خواہ زمین میں یا تمہاری جانوں میں وہ سب ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے قبل اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں۔ اور یہ کام خدا پر آسان تھا۔ آگے فرماتے ہیں لکیلا تأسوا علی ما فاتکم یہ ایک محذوف کے متعلق ہے یعنی واخبرناکم بذلک لکیلا تأسوا۔ ہم نے تم کو اس مسئلہ تقدیر کی خبر اس لئے دی تاکہ جو چیز تم سے فوت ہو جاوے اُس پر رنج نہ کرو۔ اور جو چیز تم کو عطا کی جائے اُس پر ناز نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی متکبر اترانے والے کو نہیں چاہتے۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ اعتقادِ تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں بھی راحت رہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے اُن کو زیادہ رنج نہ ہوا کرے۔ بلکہ یہ سمجھ کر کہ تقدیر میں یوں ہی تھا صبر و شکر سے کام لیا کریں۔ اب آپ دیکھ لیں کہ اعتقاد تقدیر کا یہ اثر ہمارے اندر کتنا ہے سو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہم مصائب و حوادث میں ضعف قلب

اور قلت اعتقاد کی وجہ سے ایسے ہی پریشان ہوجاتے ہیں جیسا ایک دہری یا منکر تقدیر پریشان ہوتا ہے۔ صاحبو! اگر ہم کو تقدیر پر کامل اعتقاد ہے تو اس کا اثر ظاہر میں بھی تو کچھ ہونا چاہئے یاد رکھو محض زبان سے اتنا کہدینا تو آسان ہے کہ ہم کو تقدیر پر اعتقاد ہے مگر امتحان کے وقت ہر شخص کی قلعی کھل جاتی ہے اور امتحان کا وقت وہی ہے جبکہ مصائب وحوادث کا نزول ہورہا ہو۔ اور کسی کی قلعی نہ بھی کھلے۔ تب بھی حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے۔ وہاں تو کوئی حیلہ نہیں چل سکتا ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام — در غلط اندازی تا ہر خاص وعام

کارہا با خلق آرے جملہ راست — با خدا تزویر وحیلہ کے رواست

کارہا او راست باید داشتن — رایت اخلاص وصدق افراشتن

صاحبو! جو شخص سچ مچ تقدیر کا معتقد ہے اُسکو رنج وغم کبھی نہیں ہوتا اور یہ جو کبھی کبھی آپ انکو مصائب میں غمگین دیکھتے ہیں یہ نظر بد سے بچانے کیلئے صورت رنج وغم ہے جسکو مولانا فرماتے ہیں ؎

دل ہمی گوید ازو رنجیدہ ام — وز نفاق سست او خندیدہ ام

انکو ان مصائب سے ایسی کلفت ہوتی ہے جیسے مرچوں کے کھانے والے کو کلفت ہوتی ہے کہ ظاہر میں آنسو جاری ہیں۔ مگر دلمیں ہنس رہا ہے اور مزے لے لیکر کھا رہا ہے۔ اُنکو اس میں ایسی لذت آتی ہے کہ سلطنت کے بدلہ میں بھی اپنی تنگی اور فقر وفاقہ وغیرہ کو دینا نہیں چاہتے۔

چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک شہر کے دروازہ پر پہنچے دیکھا کہ شہر پناہ کا دروازہ بند ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ دن میں دروازہ کیوں بند کیا گیا۔ کیا کسی دشمن کا خطرہ ہے لوگوں نے کہا کہ نہیں بلکہ بادشاہ کا باز اڑ گیا ہے۔ اس لئے دروازہ بند کرادیا کہیں دروازہ سے نہ نکل جائے۔ یہ سنکر آپ بہت ہنسے اور سمجھ گئے کہ بادشاہ محض احمق ہے بھلا باز کو دروازہ سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو اوپر سے بھی جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے بطور ناز کے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ سبحان اللہ یہ تو اتنا احمق اور اُس کو بادشاہ بنا دیا اور ہم ایسے عاقل اور عارف اور ہماری یہ حالت ہے کہ پیر میں جوتی بھی سالم نہیں۔ بدن پر کپڑے بھی درست نہیں۔ اُن بزرگ

کا مقام اِدلال کا تھا۔ مگر ناز ہر وقت نہیں چلتا کیونکہ کبھی وہ بھی ناز کرنے لگتے ہیں یہ کہا کہ تم تو ناز کرو اور وہ کبھی نہ کریں چنانچہ ارشاد ہوا کہ بہت اچھا کیا تم اس پر راضی ہو کہ اس بادشاہ کی حماقت و جہالت معہ سلطنت کے تم کو دیدی جائے اور تمہاری معرفت و محبت معہ فقر و تنگدستی و خستہ حالی کے اس کو دیدیجائے یہ جواب سُنتے ہی وہ بزرگ کانپ اُٹھے اور فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ میں اس گستاخی سے توبہ کرتا ہوں۔ اور اس تبادل پر ہرگز راضی نہیں تو حضرت وہ ایسا شیریں غم ہے جس سے سلطنت کے ساتھ بھی تبادل گوارا نہ ہوا۔ اور وہ ایسا درد ہے کہ اگر کوئی اُن کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر ان پر ترس کھائے اور اس سے نجات اور سکون کی دعا کرے کہ خدا تم کو اس غم سے نجات دے تو وہ یوں کہتے ہیں ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازآں آب حیات ضاعف اللہ بہ کل زماں عطشی

اور کیوں نہ ہو یہ تو محبوب حقیقی کے عاشق ہیں مجنون نے تو ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت کے غم سے بھی نجات نہیں چاہی جب اس کا عشق مشتہر ہوا۔ اور سوز و گداز سے کھانا پینا متروک ہو گیا اور دیوانوں کی طرح جنگلوں میں پھرنے لگا تو اس کا باپ مکہ معظمہ میں اس کو لایا اور کہا بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر خدا سے دعا کر کہ لیلیٰ کی محبت میرے دل سے نکالدے تو اس نے رو کر کہا کہ ؎

یا رب لا تسلبنی حبہا ابداً ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

اور کہا

الٰہی تبت من کل المعاصی ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

تو جب ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت میں غم لذیذ ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ کے عشاق کو اگر مصائب میں راحت ہو تو کیا عجب ہے اب اسکو غم کہنا ہی غلط ہے وہ واقع میں غم نہیں محض صورتِ غم ہے اور جو واقعی غم ہے اس کا شریعت مقدسہ پر عمل کرنے والے پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتا۔ یا اس کا کوئی عزیز نہیں مرتا یا اس کو دنیوی نقصان نہیں ہوتا یہ سب کچھ اُسے بھی پیش آتا ہے اور اس سے کلفت بھی اس کو ہوتی ہے مگر پریشانی و حقیقی غم نہیں ہوتا کیونکہ غم کہتے ہیں دل کی گھٹن کو اور کلفت کہتے ہیں۔ المِ دُکھن کو اہل اللہ کو مصائب

میں الم تو ہوتا ہے۔ مگر گھٹن نہیں ہوتی۔ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم میں نشتر لگائے اس وقت تم کو الم تو ہوگا مگر رنج و غم نہ ہوگا۔ گو ظاہر میں تم ہائے ہائے بھی کروگے۔ مگر دل اندر سے خوش ہوگا اور اس الم پر راضی ہوگا کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت کے موافق سمجھتے اور اپنے لئے نافع اور مفید خیال کرتے ہو یہی حال اہل اللہ کا ہو زمانہ کی مصائب حوادث کیساتھ کہ وہ انکو عین حکمت اور سراپا مصلحت سمجھتے ہیں اسلئے ہر حال میں خوش رہیں اور یوں کہتے ہیں۔ ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے　　یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

غرض جو لوگ شریعت مقدسہ کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہیں انکو غم حقیقی کبھی ہوتا ہی نہیں بس الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ؁ اپنی حقیقت پر ہے اس میں تاویل کی ضرورت نہیں مطلب یہ ہے کہ ان کو حقیقی خوف و حزن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہیں جس کا اثر یہی ہے کہ رنج و غم اور تجویز کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ایک آیت سے ثابت کیا تھا لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم پس قائل تقدیر کو آخرت میں تو خوف و حزن ہوہی گا نہیں۔ دنیا میں بھی اسکو غم نہیں ہوتا اسلئے لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ؁ ہر حال میں اپنی حقیقت پر ہے اور جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہے اس کو دنیا میں بھی غم ہے اور آخرت میں بھی۔ اور جس کا اعتقاد ضعیف ہے وہ آخرت میں تو چھٹ کر جنت میں پہنچ جائیگا۔ مگر دنیا میں عمر بھر ضرور بے چین رہیگا۔ تو کیا اچھا ہو کہ یہاں بھی راحت ہی ہو۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل و اعتقاد کو کامل کرو پھر تمہارے لئے دنیا میں بھی چین ہوگی۔ لھم البشری فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ؁ اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو اس چین کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہم کو بے چینی ہی منظور ہے تو یہ شخص قابل خطاب نہیں پھر ہم تو جب جانتے کہ یہ لوگ دنیا کی چیزوں سے بھی صبر کر لیتے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ چار پیسوں سے بھی صبر نہیں۔ اور آخرت کے بارہ میں ایسی ہمت ہے کہ وہاں کی راحت اور دنیا کی حیوۃ طیبہ سے صبر ہے۔ اس کا نام صوفیہ کے محاورات میں صبر فرعون ہے۔ مولانا اسی کی شکایت فرماتے ہیں ؎

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن　　صبر چون داری ز رب ذو المنن

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں　　صبر چون داری ز نعم الماہدون

حضرت شبلی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا ای الصبر اشد کونسا صبر زیادہ سخت ہے فرمایا الصبر باللہ۔ قال لا قال فالصبر فی اللہ قال لا قال فای قال الصبر عن اللہ یعنی حضرت شبلی رحمہ اللہ نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ صبر باللہ اشد ہے اس نے کہا نہیں۔ کہا صبر فی اللہ اشد ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا پھر تم بتلاؤ کونسا صبر اشد ہے۔ اس نے کہا الصبر عن اللہ خدا تعالیٰ کے چھوٹنے پر صبر کر لینا یہ بہت سخت ہے۔ یہ سنکر حضرت شبلی رحمہ اللہ نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو گئے۔ اسی صبر کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فما اصبرھم علی النار بہرحال مرگ مفاجات کے اسباب تراشنے والے ایک تو وہ ہیں جو خدا کے قائل نہیں ہیں۔ ان سے تو چنداں تعجب نہیں ہے مگر افسوس اب تو اکثر مسلمان بھی اسباب تراشتے ہیں اور اسباب ہی کو موثر سمجھتے ہیں پھر ان کو دنیا میں بھی تکلیف ہوتی ہے اور مرتے ہوئے بھی پریشانی ہوتی ہے یہ لوگ حیات طیبہ سے بھی محروم ہیں اور موت سے بھی بہت ڈرتے ہیں شاید یہاں کسی کو شبہ ہو کہ موت سے تو ہر شخص کو کراہت ہوتی ہے۔ اور زندگی ہر ایک کو عزیز ہے۔ کیونکہ یہ تو طبعی امر ہے تو سب ہی کو عام ہے اس کا جواب حدیث شریف میں آچکا ہے۔ حق تعالیٰ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درجات بلند فرمائیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر کے اس اشکال کو حل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ کہ جو شخص اللہ سے ملنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی لقاء سے کراہت کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی لقاء سے کراہت فرماتے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ کُلُّنَا یکرہ الموت یعنی حق تعالیٰ کی لقاء تو موت کے بعد ہوگی اور موت سے طبعاً ہر شخص کو کراہت ہے تو من احب لقاء اللہ کا مصداق کون ہوگا سب من کرہ لقاء اللہ ہی کے مصداق ہونگے اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کون دے سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ محبت لقاء اور کراہت لقاء زمانہ حیات کی نہیں ہے۔ بلکہ عین وقت موت کی محبت و کراہت مراد ہے۔ سو مومن موت کے وقت لقاء اللہ کا مشتاق ہو جاتا ہے جبکہ اس کو فرشتے بشارتیں سناتے اور تسلی دیتے ہیں اور جنت کی نعمتیں اور راحتیں دکھلاتے ہیں۔ اس وقت اس کی وہ حالت ہوتی ہے۔ جیسے ایک پرندہ پنجرہ میں ہو۔ اور اس کو ایک ایسے سبزہ زار میں رکھدیا جاوے۔ جہاں چاروں طرف پھول پھلواری اور

ہر قسم کے میوہ جات ہوں۔ اور اس کے ہمجنس پرندے آزادی کے ساتھ اس باغ میں میوے وغیرہ کھاتے پھرتے ہوں۔ اور وہ خوشی میں چہچہاتے ہوں۔ تو اس وقت یہ پرندہ جو پنجرہ میں مقید ہے پھڑپھڑاتا ہے اور پنجرہ سے نکلنے اور اپنے ہمجنسوں کے ساتھ سبزہ زار میں چلنے پھرنے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اور کافر موت کے وقت حق تعالیٰ کے پاس جانے سے کراہت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ عذاب کے فرشتے ڈراونی صورت میں چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میری روح نکلی اور ان لوگوں نے مجھے عذاب کرنا شروع کیا۔ اس وقت اس کی روح جسم سے نکلنا نہیں چاہتی جیسے پنجرہ کے گرد چاروں طرف بلیاں دانت نکالے بیٹھی ہوں۔ تو اس وقت پرندہ پنجرہ سے نکلنا نہ چاہے گا۔ بلکہ کوشش کرے گا کہ پنجرے ہی سے چمٹا رہے۔ کیونکہ اسی میں خیر ہے۔ پنجرہ سے باہر قدم رکھا اور بلیوں نے اس کو دبوچا تو یہ کراہت مراد ہے جو عین موت کے وقت ہوتی ہے۔ باقی طبعی کراہت مراد نہیں ہے۔ کیونکہ طبعاً زندگی ہر ایک کو عزیز ہے۔ چنانچہ کانپور میں ایک قصہ میرے زمانہ قیام میں ہوا تھا۔ ایک بڑھیا کا لڑکا بیمار ہوا تو وہ ہر ایک سے دعا کراتی پھرتی تھی کہ یہ اچھا ہو جائے اور میں مر جاؤں۔ اتفاق سے اس کو سکتہ سا ہو گیا۔ جس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ مر گیا ہے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا گیا۔ کچھ دیر میں اسے ہوش آگیا۔ وہ بڑھیا یہ سمجھی کہ میرا بیٹا بھوت ہو گیا تو اب وہ یہ دعا کراتی تھی کہ اللہ کرے یہ مر جائے۔ کیونکہ اب اسے اپنی موت کا اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ بھوت مجھے ہی نہ کھائے۔ اسی طرح مولانا جامی رحمۃ اللہ نے ایک عورت مہستی نام کا قصہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ مہستی بیمار ہوئی تو اس کی بوڑھی ماں یوں دعا کرتی تھی کہ کاش میں مر جاؤں اور مہستی اچھی ہو جائے۔ ایک دن اتفاق سے اس کے گھر میں ایک گائے اس حلیہ سے آئی کہ اس کے منہ میں ایک ہانڈی پھنسی ہوئی تھی۔ گائے نے کسی کی ہانڈی میں منہ ڈالا تھا۔ پھر منہ باہر نہ نکل سکا۔ کیونکہ وہ پھنس گئی تھی اب وہ ہانڈی کو لئے پھر رہی تھی۔ اس بڑھیا نے جو گائے کا یہ حلیہ دیکھا تو یوں سمجھی کہ یہ وہ ہی موت ہے جس کو میں روز بلایا کرتی تھی۔ اب تو بڑی گھبرائی اور کہنے لگی ؎

گفت اے موت من نہ مہستیم   پیر زال غریب محنتیم

اے موت مہستی میں نہیں ہوں وہ تو تیرے سامنے پلنگ پر پڑی ہے اسے لیلے میں تو غریب محنتی بڑھیا ہوں مجھے لیکر تو کیا کریگی۔ غرض اپنی زندگی ایسی عزیز ہے کہ موت کا خیال آتے ہی بیٹی کو

مارنے لگی۔ کم و بیش حیات کی محبت سب کو ہے۔ اہل اللہ بھی اس سے خالی نہیں۔ مگر جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے۔ وہ عین موت کے وقت ہشاش بشاش اور حق تعالیٰ سے ملنے کا مشتاق ہو جاتا ہے۔ مولانا فتح محمد صاحب کے ایک شاگرد مولوی نور احمد صاحب طالب علم تھے مولانا کے وصال کے بعد وہ اپنے گھر جانے لگے۔ اور سامان وغیرہ باندھ کر سب رکھدیا تھا کہ دفعۃً طاعون میں مبتلا ہو گئے لوگوں کو بہت صدمہ ہوا کہ بیچارہ کو اس وقت اپنے وطن کی کیسی حسرت ہو گی سب ان کی تسلی کرنے لگے کہ گھبراؤ نہیں انشاء اللہ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ وہ کہنے لگے کہ اب یوں نہ کہو۔ اب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر اُن کا جنازہ آیا تو گو ہم جیسوں کا ادراک ہی کیا۔ مگر مجھے ان کے جنازہ پر انوار ہی انوار معلوم ہوتے تھے۔ صاحبو! مومن چاہے کیسا ہی گنہگار ہو ایمان کی وجہ سے تو بشارت اس کو بھی ملتی ہے اس لئے وہ مرتے ہوئے ضرور خوش ہوتا ہے اور جو ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی زیادہ ہوں پھر تو اُس کی خوشی کا کیا کہنا بس بشارت عند الموت سے اگر محروم ہے تو کافر ہی محروم ہے۔ مومن چاہے کیسا ہی ہو وہ اس سے محروم نہیں گو اس کے ساتھ معاصی بھی ہوں مگر ایمان کامل ہو تو موت کے وقت اسے حق تعالیٰ سے ملنے کا اشتیاق ہوگا اور قبل موت گو اس درجہ کا اشتیاق طبعی نہ ہو۔ مگر عقلی کراہت بھی نہ ہونا چاہئے۔

کیونکہ ان نعمتوں کا مقدمہ بھی موت ہے اور جب عقلی کراہت نہ ہو گی تو پریشانی بھی اس قدر نہ ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت اس بیماری سے پریشانی اس قدر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ایمان میں بھی کمی ہے۔ اسی واسطے میں نے اس وقت اس مضمون کو بیان کیلئے اختیار کیا ہے کیونکہ بعض احباب سے معلوم ہوا کہ لوگ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بیان کی بھی درخواست کی اور یہ ظاہر کیا کہ بیان سے لوگوں کی تسلی ہو جانے کی امید ہے اس واسطے میں اس مضمون کو اختیار کرتا ہوں۔ اس وقت میں اسباب طاعون سے بحث نہیں کرتا کیونکہ اس سے مواعظ سابقہ و رسائل میں فراغت ہو چکی ہے میں نے بارہا اس کو بیان کیا ہے۔ اور وہ مضامین اکثر سامعین کے سُنے ہوئے ہیں مگر استطراداً اتنا پھر کہتا ہوں کہ اسکا سبب معاصی ہیں خصوصاً بدکاری اور سود خواری جیسا احادیث میں مصرح ہے اور افسوس سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے قصبہ میں یہ دو گناہ بہت شائع ہیں ہم کو سب گناہوں سے اور بالخصوص ان دونوں

گناہوں سے توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔ اس مبحث میں زیادہ تفصیل نہیں کرتا البتہ اپنے ایک رسالہ کا پتہ بتلائے دیتا ہوں جس کا نام "علاج القحط والوبا" ہے جس کو تفصیل کا شوق ہو وہ اس رسالہ کا مطالعہ کرے اسمیں شبہات کا بھی جواب دیا گیا ہے ہاں ایک شبہ کا جواب شاید اسمیں نہ ہو اس کو مع جواب کے اس وقت بیان کئے دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض لوگ شاید یوں کہیں کہ طاعون کے اسباب تو طبعی ہیں پھر معاصی اس کا سبب کیونکر ہو گئے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو اسباب طبعیہ کے انکار کی ضرورت نہیں گو تصدیق کی بھی ضرورت نہیں۔ مگر ہم آپ کی خاطر سے تھوڑی دیر کیلئے ان اسباب طبعیہ کو مانے لیتے ہیں۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ یہ اسباب طبعیہ طاعون کا سبب قریب ہیں یا سبب اصلی اگر آپ کہیں کہ یہ سبب قریب ہیں۔ تو ہم کہیں گے کہ پھر ان کے سبب قریب ہونے سے معاصی کی سببیت پر کیوں اشکال ہے ممکن ہے معاصی بھی سبب ہوں۔ اور سبب بعید ہوں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اسباب طبعیہ سبب قریب بھی ہیں اور یہی اصل سبب ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی سبب نہیں۔ تو اس دعوے پر دلیل قائم کیجئے۔ کیونکہ سبب واحد کیلئے اسباب مختلفہ قریب وبعید ہو سکتے ہیں پھر آپ طاعون کیلئے سببیت کو ایک ہی چیز میں کس دلیل سے منحصر کرتے ہیں۔ دیکھئے اگر ایک شخص نے کسی کو قتل کیا ہو اور اُسکی سزا میں اُسے پھانسی دیجائے جس سے قاتل مرجائے تو اب تبلائے یہاں سبب موت کیا ہوا یہاں آپ فوراً سلسلہ نسب بیان کرنا شروع کردینگے کہ اول اس نے قتل کیا تھا جسکی وجہ سے ولی مقتول نے عدالت میں دعویٰ کیا پھر اس پر گواہ قائم کر دیئے حاکم نے ثبوت لیکر اُسکو مجرم قرار دیا اور فیصلہ میں اسکو پھانسی کی سزا تجویز کی۔ اور اس کیلئے خاص تاریخ مقرر کردی یہ اس تاریخ پر حاضر رہا کہیں روپوش نہ ہو سکا۔ حاکم نے اپنے فیصلہ کے موافق جلاد کو حکم دیا کہ اسے پھانسی پر لٹکا کر تختہ کھینچ لے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ بالآخر اس کو موت آگئی دیکھئے اس شخص کی موت میں چند در چند اسباب کو دخل ہے اب اگر کوئی فلسفی کہنے لگے کہ یہ سلسلۂ نسب بالکل غلط ہے بلکہ اسکی موت کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کو پھانسی پر لٹکا کر تختہ کھینچ لیا گیا جسکی وجہ سے گلا گھٹ گیا اور آلات تنفس بند ہو گئے اس لئے موت واقع ہو گئی تو آپ اس کو کیا جواب دینگے۔ یقیناً ہر عاقل یہ کہے گا کہ یہ تو سبب قریب ہے لیکن سبب اصلی وہ جرم قتل ہی ہے جسکی وجہ سے حاکم نے اس کو پھانسی پر لٹکانے کا حکم دیا اسی طرح یہاں سمجھو کہ طاعون کا اصلی سبب معاصی ہیں جب بندے گناہ کرکے حق تعالیٰ کو ناراض

کرتے ہیں تو وہ اپنے جنود کو بنی آدم پر مُسلط کر دیتے ہیں جن میں یہ جراثیم بھی داخل ہیں جنکو تم طاعون کا سبب کہتے ہو اور جنات بھی داخل ہیں جن کے وخز کو حدیث شریف میں سبب کہا گیا ہے وما یعلم جنود ربك الا هو ط بتلایئے اب کیا اشکال رہا۔ مگر حیرت ہے کہ دنیا کی باتوں میں تو آپکی عقل ایسی تیز ہے کہ اگر کوئی سائنس داں پھانسی والے مجرم کی موت کا سبب محض آلات تنفس کا بند ہونا بتلائے تو آپ اس کے جواب میں فوراً اسباب کا سلسلہ نسب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن نہ معلوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ضد ہے کہ آپ کی ہر بات میں شبہ ہے اور یہاں یہ جواب کیوں نہیں دیا جاتا کہ حضور سبب بعید اور اصلی کو بیان فرما رہے ہیں اور تم سبب قریب کو بتلا رہے ہو حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم علاوہ نبی و رسول ہونیکے عاقل بھی اتنے بڑے ہیں کہ کفار بھی اسکے قائل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برابر کوئی عاقل نہیں ہوا۔ یہ ایک شبہ کا جواب استطراداً بیان کر دیا گیا ہے باقی اصل جواب ان شبہات کا وہ ہے جو میں نے چھتاری کے ایک بیان میں عرض کیا تھا جس میں علیگڈھی جنٹلمین بہت تھے میں نے کہا کہ آپ لوگ جو دین میں شبہات کرتے ہیں اور اُنکو حل کرنے کیلئے یہ صورت آپ نے اختیار کی ہے کہ جہاں کوئی مولوی صاحب ملے اُن پر مشق کرنے لگے تو یہ تدبیر اچھی نہیں کیونکہ اس طرح تو ساری عمر شبہات ہی میں گذر جائیگی۔ کیونکہ عقلی شبہات کے جوابات بھی عقلی ہوتے ہیں اور عقلی جواب کے مقدمات بھی عقلی ہوتے ہیں آپ کو ان مقدمات عقلیہ میں بھی شبہات ہونگے۔ پھر انکا جواب بھی عقلی ہوگا جو مقدمات عقلیہ ہی پر مبنی ہوگا ممکن ہے اس جواب کے مقدمات میں شبہ ہو جائے تو یہ تو سلسلہ غیر متناہی ہے جیسے بچوں کی کپاس کہانی یہ کمبخت ختم نہیں ہوتی۔ بس ہر بات کے بعد یوں ہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کپاس کہانی بوجھو گے دوسرا کہتا ہے بوجھیں گے مجھے تو اس کی تفصیل یاد بھی نہیں آتی بچپن کی باتیں اب کہاں یاد آئیں سہ

وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

دوسرے اگر فرض کر لیا جائے کہ عقلی جواب کے مقدمات پر آپ شبہ بھی نہ کر سکے اور سلسلہ

عہ کما فی الترغیب والترهیب قبیل کتاب قرأة القرآن عن ابی موسیٰ الاشعری رضہ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فناء امتی بالطعن والطاعون فقیل یا رسول الله هذا الطعن قد عرفناه فما الطاعون قال وخز اعدائکم من الجن وفی کل شهادة رواه احمد باسانید احدها صحیح وابو یعلی والبزار والطبرانی الوخز هو الطعن ورواه الحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم اه ۱۲

اعتراض کا ختم ہو گیا جب بھی اس تدبیر سے قلب میں سے شبہات کی جڑ نہیں کٹ سکتی اور شفا نہیں ہو سکتی جیسے سلطان محمود جب سومنات آئے تو ان کے ایک سپاہی نے دیکھا کہ ایک بڈھا بت پرست صنم کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا ہے اور رام رام کر رہا ہے۔ سپاہی نے تلوار نیام سے نکالی اور کہا او بڈھے کہہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بڈھے نے جو تلوار ننگی دیکھی کانپ گیا اور کہا اچھا کہتا ہوں۔ ذرا تلوار نیام میں کر لو اس نے ایسا ہی کیا۔ تو وہ لگا ٹالنے تھوڑی دیر کے بعد پھر سپاہی نے کہا کہہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ورنہ گردن اڑا دونگا۔ کہا اچھا بھائی کہتا ہوں مگر ذرا تم اس تلوار کو پھر نیام میں کر لو اور میرے حواس بجا ہونے دو۔ اس تلوار کو دیکھ دیکھ کر میرے حواس باختہ ہوئے جاتے ہیں۔ سپاہی نے تلوار بھی نیام میں کر لی اور کہا اچھا اب تو کہو وہ بت پرست کہنے لگا میاں سپاہی چاہے چھوڑ دو یا مار دو نوے برس کا رام تو نکلتے ہی نکلتے نکلے گا ایک دم سے تو نکل نہیں سکتا میں نے یہ حکایت کسی سے سنی ہے یہ تو معلوم نہیں کہ کس درجہ کی روایت ہے لیکن بات سچی ہے کہ نوے سال کا رام تو نکلتے ہی نکلتے نکلے گا۔ ایک دم سے تو نکل نہیں سکتا۔ شریعت نے بھی تو اس کی رعایت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وان احد من المشرکین استجارك فاجره حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغه مامنه ط ذلك بانهم قوم لا یعلمون ط اسی طرح میں کہتا ہوں کہ آپ کے یہ شبہات تو پرانے اور عمر بھر کے ہیں اور آپ چاہتے یہ ہیں کہ ایک مجلس میں ان سے شفا ہو جائے یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اب اسکی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ آپ ہر ملاقات میں ایک شبہ حل کر لیا کریں اور دوسری ملاقات میں دوسرا شبہ وعلی ہذا مگر یہ تو سنار کی کھٹ کھٹ ہے میں آپ کو دوسری تدبیر بتلاتا ہوں جو لوہار کی ایک ہے۔ وہ یہ کہ تم ان شبہات کے پیچھے نہ پڑو بس اپنے دل میں حق تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کر لو۔ یا عظمت حاصل کر لو یہ رافع شبہات ماضیہ ہونے کے ساتھ قاطع شبہات مستقبلہ بھی ہے کیونکہ محبت یا عظمت کے بعد محبوب اور معظم کے کسی حکم میں شبہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چور کو گھر میں گھسا کر نکالنا کونسی عقل کی بات ہے تدبیر ایسی کرنا چاہیے کہ چور گھر ہی میں نہ آئے تو یہ تدبیر ایسی ہی ہے کہ اس سے شبہات کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے بس یہی لوہار کی ایک ہے اور جو لوگ شبہات کا جواب دیکر تسلی کرنا چاہتے ہیں وہ سنار کی طرح کھٹ کھٹ کرتے ہیں اس میں وقت بھی بہت صرف ہوتا ہے اور سلسلہ شبہات کا ختم نہیں

ہوتا میں نے اس متعارف طرز کو چھوڑ دیا ہے آجکل زیادہ میں نئی تعلیم والوں کے ساتھ اسی علاج سے
کام لیتا ہوں۔ کہ تم کچھ دنوں ہمارے پاس آکر رہو اور جو ہم تبلائیں اس کے موافق عمل کرو۔ وہ
مدت ہم تبلادیں گے اس مدت کے گذر جانے پر شبہات بیان کرنا۔ پھر جواب دیں گے انشاءاللہ
اس مدت کے بعد ایک بھی شبہ نہ رہے گا۔ کیونکہ اس مدت کے اندر خدا اور رسول کی محبت و عظمت
قلب میں پیدا ہو جائے گی۔ باقی اس کے بغیر میں کسی شبہ کا سننا اور جواب دینا پسند نہیں کرتا۔
بلکہ اکثر لوگوں کو ضابطہ کے جواب سے ٹال دیتا ہوں۔ چنانچہ میں پچھلے دنوں علیگڈھ گیا تھا
تو کالج کے ایک حدیث داں میرے پاس آئے اور حدیث کا متن پڑھا جس میں آیا ہے
کہ طاعون معاصی سے آتا ہے اور کہنے لگے یہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کہ حدیث کا مدلول
سمجھ میں نہیں آیا یا جنابت و عقوبت میں وجہ ارتباط سمجھ میں نہیں آتی کہنے لگے معاصی اور طاعون کا
ربط سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا تو ضرر کیا ہوا۔ کیونکہ یہ تو حکم کی لم ہوئی۔ اور ضرورت صرف حکم کے
سمجھنے کی ہے ہر لم کا سمجھنا ضروری نہیں۔ آپ اس کو بدوں سمجھے ہی مان لیجئے۔ کیا ہر بات کو اس کی
لم سمجھ کر ہی ماننا ضروری ہے۔ کہنے لگے کہ لم نہ سمجھنے میں ضرر تو کچھ نہیں لیکن معلوم ہو جانے میں نفع ہے
کہ اطمینان زیادہ ہو جاتا ہے میں نے کہا اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل۔ کہنے لگے ابراہیم
علیہ السلام کا قول ہے ولکن لیطمئن قلبی میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز ابراہیم علیہ السلام کیلئے
ایک وقت میں نافع ہو۔ وہ آپ کیلئے بھی نافع ہو۔ بس اس کا جواب انکے پاس کچھ نہ تھا خاموش
ہو گئے گفتگو کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ مدعی کبھی نہ بنے ہمیشہ سائل بنا کرے کیونکہ سائل کو دلیل
وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو ایک دفعہ لانسلم کہکر چھوٹ جائیگا۔ اسمیں بہت راحت ہے
مگر موقع کا لانسلم ہو بے موقع نہ ہو ورنہ وہ قصہ ہو گا جیسے ایک بے استعداد طالب علم کو سند فراغ
دیتے ہوئے استاد نے یہ گر تبلایا تھا کہ تم سے جب کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے تو جواب میں کہدینا
کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس سے تمہارا جہل مخفی رہیگا۔ واقعی بات تو بہت گہری تبلائی مگر اس کے
استعمال کیلئے بھی تو کسی قدر عقل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک شخص سمجھ گیا کہ یہ جو ہر بات کے جواب میں
یہی کہتا ہے کہ اسمیں اختلاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ آتا جاتا نہیں اسکا امتحان کرنا چاہئے
اگلے دن اس نے آکر پوچھا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں آپ کی کیا تحقیق ہے۔ اس احمق نے

یہاں بھی وہی جواب دیا کہ اس میں اختلاف ہے۔ اب تو سب پر قلعی کھل گئی۔ یہ ویسا ہی قصہ ہوا۔ جیسے طوطی کی درین چہ شک کی حکایت ہے کہ ایک شخص نے طوطی کو یہ جملہ سکھا دیا تھا درین چہ شک۔ پھر بازار میں آکر دعویٰ کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے۔ چنانچہ ایک سوداگر نے خریدنے کا قصد کیا۔ مالک نے دام بہت بتلائے۔ سوداگر نے طوطی سے پوچھا کہ کیا تیری قیمت اتنی ہی ہے جتنی مالک بتلا رہا ہے۔ کہا درین چہ شک۔ سوداگر بہت خوش ہوا اور خرید کر گھر لایا اب جو بات بھی کرتا ہے اس کے جواب میں درین چہ شک ہی آتا ہے۔ کہنے لگا میں بہت احمق تھا جو اتنی رقم ڈال کر تجھے لایا۔ طوطی نے کہا درین چہ شک یہاں تو یہ جواب واقعی برمحل تھا۔ بہرحال میں نے خود کوئی دعویٰ نہ کیا۔ بلکہ اُن کے سوال ہی میں سے سوال نکالتا رہا حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گئے۔ پھر میں نے اُن سے یہ بھی کہدیا کہ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملانوں کے پاس آپ کے سوالات کے جوابات نہیں ہیں۔ اور یہ خیال نہ کریں کہ اس حدیث کی حقیقت کو آپکی طرح وہ بھی نہیں سمجھتے۔ بحمد اللہ ہمارے پاس حقائق و اسرار بہت کچھ ہیں مگر ہم آپ کو نہیں بتلاتے کیونکہ اسرار کا بیان کرنا ہمارے ذمہ نہیں ہمارے ذمہ احکام کا پہنچانا ہے پھر میں نے یہ شعر پڑھا ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

اور اگر کوئی یہ کہے کہ گو اسرار کا بیان کرنا ضروری نہیں۔ مگر چھپانا بھی تو ضروری نہیں پھر بیان ہی میں کیا حرج ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ غیر ضروری باتوں کے بیان کیلئے کسی محرک کی ضرورت ہے آپ وہ محرک اپنے اندر پیدا کریں۔ پھر ہم اسرار بھی آپ سے بیان کر دینگے وہ محرک ہے اُنس و بے تکلفی۔ آدمی راز کی باتیں اپنے بے تکلف دوستوں ہی سے کیا کرتا ہے تو آپ پہلے چند بار ہمارے پاس آمد و رفت کیجئے اور اُنس و بے تکلفی پیدا کیجئے۔ جب کسی وقت طبیعت میں جوش ہوگا یہ اسرار بھی بیان کر دینگے جب وہ صاحب اٹھکر چلے گئے اور اُن کے ساتھ اور بھی لوگ اٹھ گئے اور مجلس میں خاص احباب رہ گئے تو پھر میں نے معاصی اور طاعون میں تعلق اور ربط بیان کیا جو اپنے اکابر سے میں نے سنا تھا جب وہ تقریر ختم ہو گئی تو بعض احباب کہنے لگے کہ وہ صاحب اگر اس تقریر کو سنتے تو اُن کو بہت حظ آتا اور ہمارے حضرات کے علوم کے گرویدہ اور قائل ہو جاتے میں نے کہا تم کیا جانو انکو اس تقریر سے ضرر ہوتا گو اس خاص مسئلہ میں انکو اطمینان ہو جاتا۔ مگر آیندہ کیلئے یہ ضرر عظیم ہوتا کہ

وہ اطمینان کو مطلوب سمجھے ہوئے تھا۔ اس تقریر سے اُس کے خیال کی تائید ہوتی اور اس وقت جو تقریر میں نے اُن سے کی ہے گو یہ اُن کو ناگوار ہوئی ہوگی۔ مگر اس سے اُن کی بڑی غلطی کی اصلاح ہوگئی۔ کیونکہ یہ بات کسی نے بھی آجتک اُن سے نہ کہی ہوگی کہ اطمینان ہی کی کیا ضرورت ہے اور آجکل اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں کہ اطمینان کو مطلوب اور ضروری سمجھتے ہیں اور بدون حصول اطمینان کے اوامر و اخبار شرعیہ کی تصدیق نہیں کرتے اور جو تصدیق کرتے بھی ہیں تو دبے دبے کھلکر تصدیق نہیں کرتے کہ میں اس پر بے دلیل ایمان لایا۔ حالانکہ ضرورت اسی کی ہے یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ شبہات کا اصلی علاج یہ ہے کہ محبت و عظمت قلب میں پیدا کیجائے اور یہی علاج اس پریشانی کا بھی ہو جو امراض و وبا وغیرہ سے ہوتی ہو اب یہ سوال رہا کہ صاحب خدا تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کیسے پیدا ہو سو صاحبو ہم ساری دنیا کو جنید بغدادیؒ تو نہیں بنا سکتے کہ سب کے سب گھر بار کو چھوڑ کر ولی بنجائیں مگر الحمد للہ خدا کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ ساری مخلوق کو جس حال میں بھی وہ ہو ہم عاشق ضرور بنا سکتے ہیں۔ پھر محبت کے بعد نہ شبہات قلب میں آئینگے نہ حوادث سے پریشانی ہوگی اور جس کو پریشانی ہو وہ محبت حاصل کر کے دیکھ لے کہ پریشانی فوراً رفع ہو جائیگی۔ بشرطیکہ وہ ان تدابیر پر عمل کرے جو اسکو بتلائی جائیں چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے حب دنیا کی شکایت کی میں نے اُسکا علاج ذکر موت و مراقبہ موت تجویز کیا چند روز کے عمل سے اُن کو نفع ہوا مگر کہنے لگے کہ اس سے مرض حب دنیا تو کم ہوگیا۔ مگر خود موت ہر وقت سامنے ہونے لگی جس سے جی گھبراتا ہے۔ میں نے کہا اس کا کیا علاج اور گو اس کا علاج بھی ہے مگر وہ مستقل علاج ہے جس کیلئے زیادہ وقت و فرصت چاہیے۔ مگر اُن سے نہ ہوسکا انہوں نے سب چھوڑ چھاڑ دیا۔ بہر حال اگر ہمارے بتلائے ہوئے طریقہ پر استقلال سے عمل کیا جاوے تو انشاء اللہ تعالیٰ چند روز میں محبت و عظمت اور عشق کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور جو شخص کام ہی نہ کرے اُس کا تو علاج ہی کچھ نہیں۔ دیکھئے اب میں آپ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ اپنی حالت کو بدلو تمہیں اختیار ہے بدلو یا نہ بدلو لیکن اس کے ساتھ محبت و عظمت بھی حاصل کرلو۔ اور یہ وسعت میں نے اس بھروسہ پر دی ہے کہ میں جانتا ہوں کہ محبت و عظمت پیدا ہونیکے بعد آپ اس حالت موجودہ پر رہ ہی نہیں سکتے۔ یقیناً خود اس کی اصلاح کروگے لیکن اس وقت تو آپ جو کچھ کرینگے خود اپنے شوق سے کرینگے نہ کہ ہمارے کہنے سے اور اسمیں آپ کا حرج ہی کیا ہے۔ کہ ہنستے گھر بس جائے کچھ تکلیف و ناگواری بھی نہ ہو اور عبادات وغیرہ ادا ہونے لگیں۔ اور ناگواری کیسی بلکہ اُن کا ایسا شوق ہو جائے گا کہ بدون اُن کے چین ہی نہ آئیگا اور اگر

کسی کو یہ بھی ناگوار ہو کہ بدون مشقت و کلفت کے بھی اصلاح کیوں ہو تو وہ قابل خطاب نہیں جیسا کہ بعض لوگ اسی لئے وعظ میں نہیں آتے کہ کہیں ہم کو ہدایت حق نہ ہو جائے مگر یہ تو وہی طریقہ ہے جو کفار نے اختیار کیا تھا وہ کہتے تھے لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون ط کیونکہ قرآن واللہ ایسا دلکش ہے کہ خالی الذہن نے جہاں سنا اور وہ متاثر ہوا خصوصاً وہ خالی الذہن جو عربی زبان کو بھی سمجھتا ہو۔ اس لئے کفار کہا کرتے تھے کہ بس قرآن کو سنو ہی مت کہیں ہمارے خیالات خود بخود ہی نہ بدل جائیں اس کا تو سننا ہی غضب ہے یہ تو دوڑ کر لپٹتا ہے۔ واقعی اگر کسی نے خالی الذہن ہو کر تھوڑی دیر کیلئے اس کو سن لیا تو وہ بدون متاثر ہوئے اٹھا ہی نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ قریش کے چند بڑے بڑے سنڈہ اکٹھے تھے اس بارہ میں مشورہ ہو رہا تھا کہ کسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نئے دین کی اشاعت سے روکنا چاہیے۔ مشورہ سے یہ طے ہوا کہ حضور کے پاس ایک شخص کو بھیجا جائے جو آپ کو لالچ یا طمع دلا کر اپنا موافق بنانے کی کوشش کرے چنانچہ اس کام کیلئے مغیرہ ابن الولید تجویز کیا گیا (کیونکہ یہ بڑا تجربہ کار شاعر فصیح اور خطیب بلیغ ہونے کے علاوہ سلاطین کے درباروں میں بھی سفیر بنکر بار ہا گیا تھا) اس نے آکر حضورؐ کو ہر طرح کی طمع اور لالچ دی کہ اگر آپ کو سلطنت مطلوب ہو تو ہم آپ کو بادشاہ بنانے کو تیار ہیں۔ اگر مال کی ضرورت ہو تو ہم سونا چاندی کے ڈھیر لگا سکتے ہیں۔ اگر حسین جمیل عورتیں مطلوب ہیں تو عرب کی حسین سے حسین لڑکیاں آپ کیلئے موجود ہیں مگر اس نئے مذہب کی اشاعت نہ کیجئے اور اگر آپ کو کچھ سحر یا آسیب کا خلل معلوم ہوتا ہو تو آپ فرمائیں کہ ہم کسی طبیب وغیرہ کو لائیں۔ حضور نے فرمایا کہ تم کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے کہا ہاں۔ فرمایا اب میں کہتا ہوں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ حٰمٓ سجدہ پڑھنا شروع کی۔ حٰمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم ہ کتاب فصلت آیٰتہ قرآنا عربیا لقوم یعلمون بشیرا و نذیرا ط فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون ہ وقالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ وفی اذاننا وقر ومن بیننا وبینک حجاب فاعمل اننا عاملون ہ بھلا اول تو قرآن خود ہی دلکش اور شیریں ہے پھر اوپر سے حضورؐ کا پڑھنا آپ کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں۔ کان احسن الناس صوتاً۔ کہ حضور سب سے زیادہ خوش آواز تھے۔ صاحبو! جب ایک ادنیٰ عرب جو عربی طریقہ سے قرآن پڑھتا ہو سننے والوں کو مست کر دیتا ہے تو حضور کا پڑھنا کیا کچھ ہوگا۔ بس اس کافر کی یہ حالت ہوئی کہ دونوں ہاتھ پیچھے کو ٹیک کر مبہوت بنا ہوا بیٹھا رہا جس وقت حضور نے آیت

پڑھی ہے فان اعرضوا فقل انذرتکم صٰعقۃ مثل صٰعقۃ عاد وثمود ؕ تو یہ کہتا ہوا بھاگا کہ بس اب سننے کی تاب نہیں جب یہ اپنی جماعت میں واپس آیا تو ابوجہل نے دور سے چہرہ دیکھکر کہا کہ یہ تو جس حال میں گیا تھا اس پر لوٹ کر نہیں آیا بلکہ کچھ بدلکر آرہا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن سنکر متاثر ہو گیا ہے۔ ابوجہل بڑا صاحب فراست تھا اور مورخین نے لکھا ہے کہ معبر بھی بہت بڑا تھا اور اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر خواص یا لازمہ بزرگی سے نہیں ورنہ پھر ابوجہل کو بھی بزرگ مانو بلکہ اس کا مدار عقل و فراست پر ہے اگر کافر صاحب فراست ہو تو وہ بھی اچھی تعبیر دے سکتا ہے مگر آجکل تعویذ گنڈوں کی طرح تعبیر کو بھی لوازم بزرگی سے سمجھ لیا ہے بہر حال ابوجہل نے غضب کیا کہ دور سے صورت دیکھکر ہی پہچان لیا کہ اس کے قلب کی حالت بدلی ہوئی ہے جب پاس آیا تو پوچھا کہو کیا گفتگو ہوئی اس نے کہا کہ میں نے ان کو ہر طرح لالچ و طمع دی اس کے جواب میں انہوں نے قرآن کی تلاوت شروع کر دی کیا کہوں کیسا عجیب کلام ہے کچھ دیر تک تو میں حیران ہو کر سنتا رہا جب انہوں نے فان اعرضوا فقل انذرتکم صٰعقۃ مثل صٰعقۃ عاد وثمود ؕ پڑھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا اب مجھ پر بجلی گر پڑے گی۔ چونکہ قرآن میں یہ اثر ہے کہ خالی الذہن کو اس کی طرف خواہ مخواہ کشش ہوتی ہے اس لئے کفار قرآن سنتے ہی نہ تھے کہ کہیں ہدایت نہ ہو جائے۔ بلکہ جب قرآن پڑھا جاتا وہ لوگ شور و شغب کرنے لگتے یا کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ افسوس یہی حال آجکل بعض مسلمانوں کا ہے کہ وہ بھی وعظ میں اس لئے نہیں آتے کہ کہیں خود بخود اصلاح نہ ہو جائے چنانچہ اہل باطل اپنے لوگوں کو ہماری جماعت کے اختلاط سے روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان دیوبندیوں کے تو پاس جانے اور ان کی صورت دیکھنے سے بھی دوسرے پر اثر ہوتا ہے۔ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے پاس دیوبند سے فارغ ہو کر بعض طلبہ معقول پڑھنے جایا کرتے تھے کیونکہ وہ معقول میں مشہور تھے۔

پھر درس کے اندر مولانا کبھی کبھی اپنے مسلک کی تائید و تقویت میں تقریر کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دیوبندی بھی ہمارے مسلک کو تسلیم کر لیں کیونکہ استاد طبعاً چاہا کرتا ہی ہے کہ شاگرد میرے مسلک پر ہو تو اچھا ہے۔ مگر ایک دن مایوس ہو کر کہنے لگے کہ ارے دیوبندیوں کا رنگ ایسا پختہ ہوتا ہے کہ اس پر دوسرا رنگ چڑھتا ہی نہیں ہے اور یہ ہر رنگ پر جلدی سے چڑھ جاتا ہے۔

اسی لئے اہل باطل اپنی جماعت کو دیوبندیوں سے روکتے ہیں اور بعض لوگ خود بھی اس خوف سے

ڈر گئے ہیں کہ کہیں ہم بھی ایسے ہی نہ ہو جائیں ایک مولوی صاحب الٰہ آبادی ہمارے دوست ہیں۔ انگریزی میں بی اے فیل ہیں (تبسم کرتے ہوئے فرمایا) یہ بھی ایک فخر ہے کہ ہمارے دوستوں میں بھی بی اے ہیں۔ گو فیل وہ اپنے کسی فعل سے ہوئے۔ اب الٰہ آباد کے ایک اسکول میں مدرس ہیں۔ جب میں الٰہ آباد ایک بار گیا تو وہ وعظ سننے آئے اور ان کے ساتھ اسکول کے طلبہ بھی آئے پھر دوبارہ وعظ ہوا۔ اور ان مولوی صاحب نے اسکول کے طلبہ سے کہا کہ وعظ میں چلتے ہو کہنے لگے کہ نہیں صاحب ہمیں اندیشہ ہے کہیں ہم بھی تم جیسے نہ ہو جائیں پہلے ہی وعظ میں ہم کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں ہمارے خیالات ترقی بدل نہ جائیں۔ اور صاحب ہمیں تو ابھی بہت کام کرنا ہیں ملازمت وغیرہ کی امیدیں ہیں ہم ابھی سے تارک و زاہد کیونکر بن سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی ایسی مثال ہے جیسے مریض یوں کہے کہ ہمیں تو صحت مرغوب نہیں۔ بلکہ مرض ہی محبوب ہے کیونکہ اس وقت خمیرہ گاؤزبان تو کھانے کو ملتا ہے اس کمبخت کو یہ معلوم نہیں کہ صحت میں وہ لذت ہے کہ تندرست آدمی کو روکھی روٹی بھی خمیرہ گاؤزبان سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اشتہا صادق ہوتی ہے اسی طرح لوگ طاعات میں لگ جانے سے ڈرتے ہیں۔ اور یوں سمجھتے ہیں کہ معاصی کی لذت ہم سے چھوٹ جائے گی۔ حالانکہ بعد طاعات میں وہ لذت ہے جو معاصی میں ہرگز نہیں مگر میں ایسا طریقہ بتلاتا ہوں کہ معاصی کے ساتھ بھی آپ کو راحت باطنی حاصل ہو جائے گی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ معاصی بھی چھڑا دے گی۔ وہ طریقہ محبت ہے اور اس کی تحصیل کیلئے دو طریقے ہیں یا تو اول طاعات میں مشغول ہو اس سے محبت پیدا ہو جائیگی۔ یا اول محبت حاصل کرے اس سے معاصی چھوٹ کر طاعات کی توفیق ہو جائیگی۔ یہ بات حق تعالیٰ ہی کے دربار میں ہے کہ چاہے پہلے بی اے پاس کرو پھر ملازمت لیو۔ یا پہلے ملازمت کرو پھر ساتھ ساتھ بی اے پاس بھی ہونا رہیگا۔ سلاطین دنیا کے یہاں تو یہ قاعدہ ہے کہ پہلے امتحان پاس کرو پھر ملازمت ملیگی اور جو شخص پہلے ملازمت لینا چاہے تو اول تو ایسے جاہل کو جس نے کوئی امتحان پاس نہ کیا ہو۔ ملازمت ہی نہیں ملتی اور جو محنت و مزدوری کی قسم سے کچھ ملتی بھی ہے تو اس کے ساتھ تکمیل علم نہیں ہو سکتی۔ ایسا دربار کہاں ہے کہ چاہے اول علم و عمل حاصل کر لو تب ملازمت مل جاتی ہے یا پہلے ملازمت کر لو تو تعلیم بھی کامل ہو جاتی ہے واقعی عجیب دربار ہے اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی ان یکون الا للہ کہ ہم نے علم دین پڑھا تو تھا غیر خدا کے لئے مثلاً منصب وغیرہ حاصل کرنے کے لئے

کیونکہ پہلے تو علماء بڑے بڑے منصب والے تھے۔ قاضی مفتی منصف صدراعلیٰ اور وزیر اور متولی اوقاف وغیرہ ان عہدوں پر یہی ہوتے تھے۔ اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اب بھی وکیل صاحب اور منصف و ڈپٹی کلکٹر صاحب مولوی کہلاتے ہیں کیونکہ اس منصب پر قدیم زمانہ میں علماء ہی ہوتے تھے۔ اب ذوات کی تو تبدیل ہوگئی مگر عہدہ کیلئے مولوی صاحب کا لقب باقی رہ گیا۔ کانپور میں ایک وکیل صاحب کے ہاں ناچ تھا۔ تو لوگ بازار میں ایک دوسرے سے یوں کہتے تھے کہ میاں چلو آج فلاں مولوی صاحب کے یہاں ناچ ہے۔ کیونکہ وہ وکیل صاحب مولوی صاحب مشہور تھے مگر بس ایسے ہی مولوی تھے (یعنی خدائی مولوی نہ تھے سرکاری مولوی تھے) اور غدر سے پہلے تو عموماً انگریزی حکومت کے بھی بڑے بڑے عہدوں پر علماء ہی مقرر ہوا کرتے تھے اور غدر کے بعد بھی اول اول علماء ان منصبوں پر رہے مگر اب کچھ دنوں سے جب کہ انگریزی دانی کی شرط لگ گئی۔ علماء ان سے علیحدہ ہو گئے۔ مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی بڑے فاضل تھے خصوص ادب و معقول میں بہت مشہور تھے۔ ان کے پاس وکالت کا پاس موجود تھا۔ کیونکہ ابتداء میں اس کیلئے انگریزی دانی کی ضرورت نہ تھی۔ مولوی صاحب معقولی تو بہت تھے مگر نظائر وغیرہ بہت کم دیکھتے تھے اور آجکل مقدمات زیادہ تر نظائر پر ہوتے ہیں اس لئے بحث میں مولوی صاحب کی وکالت زوردار نہ تھی۔ مگر پھر بھی لوگ ان کے پاس مقدمات بہت زیادہ لاتے تھے کیونکہ اکثر حکام مولوی صاحب کے شاگرد تھے۔ بس جس مقدمہ میں آپ کی بحث کمزور ہوئی شام کو حاکم کے بنگلہ پر پہنچ گئے اور فرمایا کہ دیکھو جی اس طرح فیصلہ کرنا پڑے گا۔ ایک ڈپٹی یا منصف صاحب کہتے تھے کہ مولوی صاحب تو زبردستی کی وکالت کرتے ہیں کہ ہماری گردنیں دباتے ہیں ہم ان کی بات کو رد نہیں کرتے کیونکہ اُستاد ہیں عوام کو بھی یہ راز معلوم ہو گیا ہے۔ اس لئے مقدمات ان کے پاس خاصے جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک اور مولوی صاحب وکالت کرتے تھے مگر بھولے بہت تھے ایک دفعہ آپ مدعا علیہ کے وکیل تھے مگر عدالت میں پہنچکر برعکس یہ خیال رہا کہ مدعی کا وکیل ہوں اب آپ نے مدعی کا حق ثابت کرنے کیلئے تقریر شروع کی۔ اور اس کی تائید میں چودہ پندرہ دلیلیں بیان کیں۔ مدعا علیہ کا تو رنگ زرد ہو گیا کہ مولوی صاحب تو میرے وکیل تھے یہ مدعی کی تائید کیوں کرنے لگے۔ پھر سمجھا کہ مولوی صاحب بھولے تو ہیں ہی شاید وہ بھول گئے کہ میں کس کا وکیل تھا

آخر اس نے مولوی صاحب کو اشارہ کیا۔ آپ سمجھ گئے کہ میں نے تو ساری تقریر اپنے موکل کے خلاف کی۔ مگر ذہانت تو دیکھئے کہ مدعی کی اس قدر تائید کر کے آپ نے تقریر کا رُخ کس خوبصورتی سے بدلا کہ چودہ پندرہ دلائل قائم کر کے آپ نے مدعی سے اور اس کے وکیل سے دریافت کیا۔ کیوں صاحب آپ کے پاس یہی دلائل ہیں یا کچھ اور بھی ہیں؟ مدعی کے تو باپ کو بھی یہ دلائل نہ سوجھتے اس نے خوش ہو کر کہا ہاں حضور میرے یہی دلائل ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ یہ سب دلائل غلط اور لغو ہیں میں ان سب کا جواب دیتا ہوں۔ پھر ایک ایک کر کے سب کو توڑ دیا۔ تمام عدالت والے حیران تھے کہ بھولے پر بھی کس خوبصورتی سے مقدمہ کو سنبھالا ہے اور جن دلائل کو اول نہایت زور کے ساتھ خود قائم کیا تھا۔ ان کو کس قوت کے ساتھ بعد میں توڑا ہے کانپور میں ایک مولوی صاحب سب جج تھے اس وقت مولانا شاہ سلامت اللہ صاحب بھی کانپور میں موجود تھے یہ شاہ سلامت اللہ صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے واعظ بھی بہت بڑے تھے اور تفسیر و معقول میں تو امام تھے ایک دفعہ وعظ کے بعد کسی نے شاہ صاحب سے استفتا کیا وہ سب جج بھی حاضر تھے آپ نے جواب دیا۔ اس نے کہا حضور میں نے سب جج صاحب سے بھی یہ مسئلہ دریافت کیا تھا وہ تو یوں کہتے ہیں پہلے زمانہ کے مولوی تو آزاد تھے اور اہل کمال مستغنی ہوا ہی کرتے ہیں شاہ صاحب نے بیساختہ فرمایا کہ سب جج صاحب گو کھاتے ہیں اس پر سب جج صاحب کی اہلیت دیکھئے کہ باوجود عالم ہونے کے برا نہیں مانا بلکہ ادب سے عرض کیا کہ حضرت نے سچ فرمایا واقعی میں تو دنیا کا کتا ہوں۔ مجھے افتاء کا کام کرنا زیبا نہیں یہ کام تو آپ ہی حضرات کا ہے آجکل اگر کوئی مولوی کسی کو ایسا سخت کلمہ کہدے تو اسے بے تہذیب وغیرہ کا خطاب مل جائے کیوں صاحب آج کل تو ہر شخص آزادی کا طالب ہے۔ پھر مولویوں کو بھی تو آزادی دو۔ ورنہ ان کو مولوی نہ کہو کیونکہ مولوی کہنا اپنے سے بڑا تسلیم کرنا ہے پھر ان کو پابند کرنا اور خود آزاد ہونا خلاف انسانیت ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ پہلے حکومت کے بڑے بڑے عہدے مولویوں کے ہاتھ میں تھے اور اس زمانہ میں بھی ریاستوں کے اندر قاضی وغیرہ علماء ہی ہوتے ہیں چنانچہ ہمارے ایک دوست ابھی حیدرآباد کے قاضی ہوئے تھے ایک ہزار روپے تنخواہ تھی ایک اور مولوی حیدرآباد میں ہیں جو مالی خدمت پر ہیں انکی دو ہزار روپیہ تنخواہ ہے۔ گو دل تو نہیں چاہتا کہ

مولویوں کی تنخواہ پچاس ساٹھ سے بڑھے پہلے تو دس بیس سے زیادہ کو جی نہ چاہتا تھا مگر اب دیسی برکت نہ رہی تو اب پچاس ساٹھ سے زیادہ کو دل نہیں چاہتا۔ کیونکہ زیادہ تو سیفسہ ہے۔ مگر ظاہر میں اہل دنیا کے سامنے فخر کرنے کو ایسی حکایتیں بیان کر کے جی خوش ہو جاتا ہے کہ ہماری جماعت میں بھی ایسے ترقی یافتہ موجود ہیں جن کی تنخواہ ہزار دو ہزار ہے اور بدول انگریزی پڑھے ہوئے۔ اُن کی اس قدر تنخواہ ہو گئی۔ گو اندر سے تو دل خوش نہیں ہوتا۔ مگر اُن لوگوں کا منہ بند کرنے کو ایسے واقعات اچھے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ علم دین سے آدمی دنیا کے کام کا نہیں رہتا اور اس زمانہ سے پہلے زمانہ میں تو علماء ہی کیلئے یہ مناصب مخصوص تھے دوسروں کو ملتے ہی نہ تھے۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ گو ہم نے علم تو حاصل کیا تھا دوسری غرض سے کہ قاضی یا مفتی یا وزیر ہو جائیں گے۔ مگر علم کسی کا ہو کر نہ رہا۔ وہ خدا ہی کا ہو کر رہا اور آخر کار ہم کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف کھینچکر پہنچا دیا۔ واقعی یہ علم دین ضرور اثر کرتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اپنا رنگ دکھاتا ہے اسی واسطے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ گو وہ علم دین جو بغیر اللہ پڑھا جائے موجب ثواب اور سبب نضیلت نہیں مگر معقول وغیرہ سے پھر بھی اچھا ہے۔ کیونکہ اس میں اخلاق حسنہ و اعمال واجبہ کی تعلیم تو ہے اور ان کے ترک پر وعیدیں بھی مذکور ہیں۔ جن سے کسی قدر خشیت ضرور پیدا ہوگی جو کبھی نہ کبھی اپنا اثر دکھاوے گی اور معقول میں یہ بات کہاں؟ وہاں تو سوائے قیل وقال کے کچھ بھی نہیں۔ نہ کسی واجب کا امر نہ اس کے ترک پر وعید تو جیسے علم بغیر اللہ بھی نافع ہو جاتا ہے اور ایک وقت میں وہ خدا کا بنا دیتا ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ تم محبت پیدا کر لو یہ خود ہی سب معاصی کو چھڑا دے گی۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ پہلے معاصی کو چھوڑو تب محبت حاصل کرو بلکہ تم جس حال میں ہو اسی حال میں آ جاؤ اور طریقہ پر عمل کرو انشاء اللہ اس حال میں بھی محبت پیدا ہو جائے گی۔ پھر یہ خود ہی معاصی کو بھی جلا پھونک دیگی۔ ہمارے حاجی صاحب اور حافظ محمد ضامن صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ کی رائے میں بیعت کے متعلق اختلاف تھا۔ حافظ صاحب کی رائے یہ تھی کہ طالب طریق کو اصلاح اخلاق کا طریقہ اول بتلایا جاوے جب اخلاق درست ہو جائیں تب داخل سلسلہ کیا جاوے اور حاجی صاحب کی رائے یہ تھی کہ اول سلسلہ میں داخل کر لیتے پھر اصلاح فرماتے تھے پھر اصلاح یا تو شیخ کی برکت سے ہو جاوے یا کسی کی حرکت سے ہو جاوے

یعنی وہ حرکت یا مرید کی طرف سے ہو یا شیخ کو اجازت دو کہ وہ حرکت کہے کہ تمہاری مرمت کیا کرے

تو صاحب حاجی صاحب میں تو برکت بہت زیادہ تھی اس لئے وہاں داخل سلسلہ کرتے ہی مرید کی

اصلاح ہو جاتی تھی اور ہم لوگوں میں یہ برکت کہاں یہاں تو حرکت سے کام چلیگا حضرت حاجی صاحب

کی برکت کی تو یہ کیفیت تھی کہ ایک رند صاحب مجھ سے خود اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ وہ حضرت کی خدمت

میں بیعت ہونے آئے اور بیعت کے وقت کہنے لگے حضرت میں اس شرط سے بیعت ہوتا ہوں کہ

ناچ دیکھنا نہ چھوڑونگا اور نماز نہیں پڑھونگا حضرت نے یہ شرط منظور فرمالی اور فرمایا بھائی ایک

شرط ہماری بھی ہے وہ یہ کہ ہم کچھ مختصر سا ذکر بتلاوینگے تھوڑی دیر کا ہے تم روزانہ بلا ناغہ اسے

کرلیا کرنا اس نے یہ شرط منظور کرلی۔ اور حضرت نے بیعت فرمالیا۔ یہاں اہل ظاہر کو شبہ ہوگا

کہ حضرت نے اس شخص کو ناچ دیکھنے اور نماز نہ پڑھنے کی اجازت دیدی یہ غلط ہے بلکہ یہ محض

ظاہر میں اجازت تھی اور باطناً اس کو اچھی طرح جکڑ دیا گیا تھا یہ واقعہ اس واقعہ کی نظیر ہے جو

حدیث شریف میں آتا ہے کہ وفد بنی ثقیف نے اسلام لانے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط

کی تھی کہ ہم زکوۃ نہ دیں گے اور جہاد نہ کریں گے حضور نے اس شرط کو منظور فرمالیا صحابہ رضی اللہ عنہم

کو اشکال پیش آیا اور انہوں نے آپ سے دریافت کیا تو فرمایا کہ اسلام تو لانے دو اسلام کے بعد وہ

سب کچھ کریں گے چنانچہ اسلام کے بعد ان لوگوں نے سب کچھ کیا۔ اسی طرح حاجی صاحب کو حق تعالیٰ

کے بھروسہ پر یہ اعتماد تھا کہ خدا کا نام لینا جب یہ شروع کریگا تو نماز بھی پڑھے گا اور ناچ بھی چھوڑ

دیگا چنانچہ حضرت کا خیال درست ہوا حضرت کی برکت و دعا و توجہ کا اس طرح حق تعالیٰ نے ظہور

فرمایا کہ جب بیعت ہونے کے بعد پہلی ہی نماز کا وقت آیا تو اس شخص کے بدن میں خارش پیدا ہوئی

گویا ایک غیبی سپاہی مسلط ہو گیا۔ خارش اس قدر بڑھی کہ ذرا سی دیر میں بیچین کر دیا اور جو تدبیریں

کرتے ہیں زیادتی ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر معاً خیال آیا کہ لاؤ ذرا ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھولیں

شاید اس سے کچھ گرمی کو سکون ہو۔ ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال کر یہ خیال ہوا کہ لاؤ وضو ہی کرلیں وضو

کا پورا ہونا تھا کہ آدھی خارش کم ہو گئی۔ پھر خیال ہوا کہ لاؤ نماز بھی پڑھ لیں کوئی نماز پڑھنے سے قسم تو

کھائی نہیں۔ ہاں پیر سے یہ شرط کرلی ہے کہ نماز کی پابندی نہ کرنے پر مجبور تو کا نہ جائے چنانچہ نماز

کو کھڑے ہو گئے نماز کا شروع کرنا تھا کہ خارش کو بالکل سکون ہو گیا۔ ایک وقت تو اس کو اتفاقی امر

سمجھا گیا مگر جب دوسرے اور تیسرے وقت بھی یہی کیفیت ہوئی کہ نماز کے وقت خارش اٹھتی۔ اور آدھی تو وضو سے کم ہو جاتی اور نماز سے بالکل سکون ہو جاتا تو وہ شخص سمجھ گیا کہ یہ پیر کی کرامت ہے مجھ سے تو کہہ دیا کہ شرط منظور ہے اور اندر ہی اندر ایک سپاہی مسلط کر دیا۔ پھر وہ نماز کے پابند ہو گئے پھر یہ خیال ہوا کہ پانچ وقت دربار الٰہی میں حاضری دیکر پھر ناچ کیا دیکھیں۔ سو ناچ سے بھی ان کو نفرت ہو گئی۔ تو حضرت کی تو ایسی برکت تھی کہ دوسرا کچھ کرنا بھی نہ چاہے جب بھی وہ دوسرے طریقہ سے کام لے لیا کرتے تھے۔ لیکن اب ایسی برکت کہاں اب تو اس کی ضرورت ہے کہ طالب خود بھی کچھ کرے اور جو طریقہ بتلایا جاوے اس پر عمل کرے خواہ کامل مجاہدہ نہ کرے اس سے تو انشاء اللہ تعالیٰ چند روز میں محبت پیدا ہو جائے گی اور چونکہ میرے شیخ کا یہی طرز تھا کہ وہ اول طالب کے اندر محبت پیدا کرتے تھے پھر اعمال وغیرہ کی اصلاح کرتے تھے۔ یہی طرز مجھے بھی پسند ہے تو محبت قائد ہے اس سے انسان خود بخود بہت جلد حق تعالیٰ تک کھنچا چلا جاتا ہے اور خوف سائق ہے وہ پیچھے سے ہانکتا ہے کہ گو جی نہ چاہے مگر زبردستی چلنا پڑتا ہے اسی واسطے کفار کے بارہ میں فرماتے ہیں وسیق الذین کفروا الی جھنم زمرا کہ وہ جہنم کی طرف باوجود کراہت کے پیچھے سے ہانک کر لیجائے جائیں گے جیسے جانوروں کو لیجایا کرتے ہیں مگر شاید یہاں کسی کو اشکال ہو کہ اس کے بعد مسلمانوں کے واسطے بھی تو وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا فرمایا گیا ہے تو کیا وہ بھی اسی طرح ہانک کر لیجائے جائیں گے۔ اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ اس جگہ سوق کا اطلاق مشاکلت کے طور پر ہے جیسے جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا۔ اور اگر مشاکلت نہ ہو تو پھر جواب یہ ہے کہ سوق کے اصل معنی تقاضا سے لیجانا ہے پھر کبھی تو تقاضا کے ساتھ تذلیل بھی ہوتی ہے جب کہ دوسرا شخص جانا ہی نہ چاہے اور کبھی محض تقاضا ہوتا ہے تذلیل نہیں ہوتی جیسے آپ اپنے لڑکے کو ساتھ لیکر سفر میں جائیں اور وہ راستہ میں ہر شہر کی سیر کرنا اور ہر دوکان بازار کو دیکھنا چاہے تو آپ تقاضا کرتے ہیں کہ میاں جلدی چلو یہاں کیا رکھا ہے منزل پر پہنچکر ہر قسم کا سامان راحت مہیا ملے گا۔ اس صورت میں بھی سوق کا اطلاق ہو سکتا ہے مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار میں تھانہ بھون سے دیوبند گھوڑے پر گیا تھا ایک مزدور یا ملازم ساتھ تھا اور کوئی بڑا ساتھ نہ تھا جھڑبیریوں کا موسم تھا تو میں راستہ میں جگہ جگہ اترتا اور بیر توڑ کر کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ بہت دیر ہو گئی اور دیوبند نا وقت پہنچا۔ اگر اس وقت کوئی شفیق اور خیر خواہ میرے ساتھ ہوتا تو

وہ ضرور مجھے اس حرکت سے روکتا اور تقاضا کرکے منزل پر جلدی پہنچانے کی کوشش کرتا ان مقدمات کو سُنکر اب سمجھئے کہ جنت میں جیسی لذت و راحت ہے وہ ظاہر ہے۔ مگر جنت کے ارد گرد بھی پھول پھلواری اور زینت و آرائش اس قدر ہے کہ دنیا میں کسی کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی تو جس وقت مسلمان جنت کی طرف چلیں گے اس وقت وہ راستہ کی زینت اور آرائش کی سیر میں مشغول ہو جائیں گے اور اس کے دیکھنے کیلئے ٹھہر جائیں گے کہ بھائی یہ پھول پتی بڑی عجیب ہے ذرا اس کی بھی تو سیر کر لیں۔ یہ باغ تو نہایت ہی بےنظیر ہے اس کو بھی تو دیکھیں اس وقت فرشتے تقاضا کریں گے کہ تم کا ہے کی سیر میں لگ گئے تم جلدی سے جنت میں پہنچو۔ وہاں ان سب سے زیادہ عجیب و غریب پھول پھلواری اور میوہ جات ہیں اور وہاں حوریں ہیں غلمان ہیں۔ ذرا تم قدم اٹھا کر وہاں تو پہنچ جاؤ پھر ان سب کو بھول جاؤ گے یہ سن کر مسلمان کچھ تیزی کریں گے کہ تھوڑی دور پر کوئی اور سیر گاہ نظر پڑے گی اس کی سیر کرنے لگیں گے۔ فرشتے پھر جلدی چلنے کا تقاضا کریں گے۔ کیونکہ وہ خیر خواہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ جنت کو دیکھکر یہ خود افسوس کریں گے کہ ہم نے خواہ مخواہ راستے کی چیزوں میں دیر کی جنت کے سامنے تو سب گرد ہیں اس واسطے مسلمانوں کیلئے بھی وسیق فرمایا۔ کیونکہ یہ بھی تقاضا کے ساتھ لیجائے جائیں گے گو ان کا تقاضا اور طرح کا ہے اور کفار کا تقاضا دوسری طرح کا ہے مگر معنی سوق کے دونوں جگہ متحقق ہیں یہ تو درمیان میں ایک نکتہ کا بیان تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ محبت سب سے بڑا قاعدہ ہے اس وقت میں اسی کو قائد بناتا ہوں اور اس پریشانی کا علاج اسی سے کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اول آیت کا حاصل سُن لیجئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں سُنی جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے یہ استفہام تعجب کیلئے ہے کہ یہ قصہ بہت عجیب ہے چنانچہ ہمارے محاورات میں بھی ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ تمہیں خبر بھی ہے کہ آج ایسا ہو گیا۔ اس سوال و استفہام سے محض تعجب دلانا مقصود ہوتا ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ قصہ بنی اسرائیل کی ایک بستی کا ہے۔ وہاں طاعون ہوا تھا جس سے گھبرا کر لوگ بھاگ گئے مگر حق تعالیٰ نے حذر الموت فرمایا ہے۔ حذر الطاعون نہیں فرمایا۔ کیونکہ خوف تو اصل موت ہی کا ہے اور طاعون کا خوف بھی اسی لئے ہے کہ وہ اسباب موت سے ہے فقال لھم اللہ موتوا حق تعالیٰ نے ان سب سے کہا مر جاؤ سب مر گئے۔ موت ہی سے بھاگے تھے۔ اور موت ہی نے پکڑ لیا واقعی خدا تعالیٰ کے سوا کسی جگہ پناہ نہیں

مل سکتی۔ بھاگنے سے کیا ہوتا ہے۔ بلکہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ طاعون سے بھاگنے والے بہت کم بچتے ہیں۔ وہ دوسری جگہ جاکر بھی مبتلائے طاعون ہوجاتے ہیں اس کے علاوہ یہ لوگ دوسروں کی نظروں میں ذلیل بھی ہوتے ہیں۔ دوسری بستی والے ان سے ملنے ملانے میں پرہیز کرتے ہیں۔ پھر ذلت گوارا کرنے پر موت سے وہاں بھی بچاؤ نہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر گریزی بر امید راحتے — ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست — جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

ثم احیاھم یعنی پھر حق تعالیٰ نے اُن کو دفعۃً زندہ کر دیا بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حزقیل علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہوئے۔ ایک تو ان سب کا دفعۃً مرجانا عجیب تھا پھر سب کا دفعۃً زندہ ہو جانا اُس سے بڑھ کر عجیب ہوا کیونکہ موت کیلئے تو اہل طبعیات ظاہر میں کوئی سبب تراش بھی سکتے تھے مثلاً یہی کہ طاعون کی جگہ سے آرہے تھے وہاں کی آب و ہوا اثر کر چکی تھی اس لئے مر گئے مگر زندہ ہونے کیلئے کون سبب نکالا جائیگا اور اگر اس کا بھی کوئی سبب ہوتا تو لوگ اُسکو بھی اختیار کرتے اور اگر کسیکو دعویٰ ہو کہ اسکا بھی کوئی طبعی سبب تھا تو میں اُنسے کہتا ہوں کہ ذرا مہربانی کرکے آجکل بھی اس سبب سے کام لیکر دکھا دیجئے اور حقیقت میں تو انکی موت بھی بلا سبب ظاہری تھی کیونکہ تبدیل آب و ہوا کو اور طاعون کی جگہ سے چلے جانے کو اطباء یا ڈاکٹر تو سبب موت کہہ نہیں سکتے بلکہ وہ تو اس کو سبب حیات بتلاتے ہیں۔ رہا اثر سابق سو اول تو مدت کے بعد میں اس اثر کو ضعیف ہو جانا چاہیے نہ کہ قوی دوسرے اتنی بڑی جماعت میں ایک وقت میں اور ایک درجہ میں اثر ہونا یہ خود قانون طبعی کے خلاف ہے پس واقع میں سب کا دفعۃً مرجانا اور دفعۃً زندہ ہو جانا دونوں واقعے عجیب اور خلاف عادت ہی تھے جن سے حق تعالیٰ کو اس امر کا اظہار مقصود تھا کہ احیاء و اماتت ہمارے قبضہ میں ہے کہ خلاف مقتضاء اسباب بھی واقع کر سکتے ہیں فرار سے کچھ نہیں ہوتا اور پہلی امتوں میں ایسے ایسے عجائبات بہت ہوتے تھے آجکل ایسی کھلی کھلی نشانیاں ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ اب تو جو کچھ ہوتا ہے۔ اسباب کے درجہ میں ہوتا ہے کیونکہ کھلم کھلا واقعات کے بعد انکار کرنے پر عذاب بھی بہت سخت ہوتا تھا اور اس امت پر رحمت زیادہ ہے اس لئے اب جو کچھ نشانات ظاہر ہوتے ہیں اسباب کے پردہ میں ہوتے ہیں اُن سے عدم تذکر پر عذاب بھی کم ہوتا ہے دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس امت کے کفار پر بھی رحمت ہے کہ پہلی امتوں کے کفار کی طرح

ان پر سخت عذاب نہیں آتا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ان اللہ لذو فضل علی الناس ولکن اکثر الناس لایشکرون ط یہاں مفسرین نے الناس کو عام لیا ہے اور یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حق تعالےٰ لوگوں پر بہت فضل کرنے والے ہیں کہ ایسے ایسے عجائبات و واقعات سے اُن کو ہدایت فرماتے ہیں۔ یا یہ کہ قہر کے بعد لطف بھی بے انتہا ہوتا ہے تو فضل سے مراد یہ لطف ہو جائیگا۔ مگر میرے ذوق میں الناس سے یہاں مراد اُمت محمدیہ ہے بنی اسرائیل کا واقعہ سُناکر یہ مضمون حق تعالیٰ نے ہم کو سنایا ہے کہ تم پر اے اُمت محمدیہ حق تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ پہلے لوگوں کے قصے سُناکر تم کو عبرت دیتے ہیں یہ نہیں کیا کہ تم کو معذب کر کے دوسروں کو عبرت دیں جیسے ایک شاعر کے متعلق کسی قصور پر بادشاہ نے حکم قتل صادر فرمایا تو وہ بادشاہ سے لجاجت کے ساتھ معافی چاہنے لگا کہ مجھے قتل سے معاف کیا جائے۔ بادشاہ نے کہا ہرگز نہیں کیونکہ تمہارے قتل میں حکمت ہے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ شاعر نے کہا حضور یہ حکمت تو اس طرح بھی حاصل ہو سکتی ہے کہ آپ کسی دوسرے کو مار دیجئے تاکہ مجھے عبرت ہو۔ یہ جواب سُنکر بادشاہ کو ہنسی آگئی۔ ایشیائی بادشاہوں کی تو ہنسی ہی معافی ہے اس کو چھوڑ دیا تو جیسے اس شاعر نے کہا تھا کہ دوسرے کو مار دیجئے تاکہ مجھے عبرت ہو حق تعالیٰ نے آپکے واسطے ایسا ہی کیا کہ دوسرے کو تمہارے لئے نمونہ عبرت بنا دیا تم کو ہلاک کر کے کسی کے لئے نمونہ عبرت نہیں بنایا۔ چنانچہ اس قصہ میں ہمارے لئے چند سبق ہیں اس سے ہمارے اعتقاد کی بھی اصلاح کی گئی ہے اور اعمال کی بھی۔ اعتقاد کی اصلاح تو یہ ہوئی کہ اب اس واقعہ کو سنکر تم اسباب کو مؤثر نہ سمجھو گے۔ جیسا کہ آجکل بعض ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس بستی میں طاعون ہو وہاں رہنے سے طاعون ضرور ہی ہو جاویگا پھر اس خیال سے دوسرا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طاعون کی جگہ سے بھاگنا چاہئے چنانچہ بہت لوگ ہماری بستی سے بھی بھاگنے لگے کوئی میرٹھ جاتا ہے کوئی کیرانہ اور مظفر نگر جا رہا ہے۔ حالانکہ احادیث میں تصریح ہے کہ فرار من الطاعون ایسا حرام ہے جیسا کفار کے مقابلہ سے بھاگنا اس پر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ تو صاحب شریعت نے احتیاط کو بھی حرام کر دیا۔ چنانچہ چند سال ہوئے ایک پنشنر تحصیلدار صاحب نے مجھ سے ہی کہا تھا کہ طاعون کی جگہ سے بھاگنا طبعاً مفید ہے اور احتیاط اسی میں ہے کہ ایسی جگہ کو چھوڑ دیا جائے۔ پھر شریعت نے اس احتیاط کو کیوں حرام کیا ہے میں نے کہا تحصیلدار صاحب

آجکل جو گورنمنٹ کے حکم سے رنگروٹ بھرتی کرکے لام پر بھیجے جارہے ہیں (اس وقت لڑائی کے لئے بہت آدمی بھرتی کئے جارہے تھے) آپ کو خبر بھی ہے کہ گورنمنٹ کا قانون یہ ہے کہ میدان جنگ سے جو بھاگتا ہے اس کو گولی مار دیتے ہیں۔ میدان سے بھاگنے کی اجازت نہیں حالانکہ وہ غریب بھی تو احتیاط ہی کرتا ہے۔ آپ کو گورنمنٹ کے اس قاعدہ پر کبھی اعتراض نہ ہوا اور بھیجنے والوں سے نہ کہا کہ کیسی جگہ مخلوق خدا کو بھیج رہے ہو جہاں احتیاط کی بھی اجازت نہ ہو بس یہ جواب سنکر خاموش ہی تو ہو گئے۔ کہنے لگے کہ ساری عمر کا جہل اب رفع ہوا۔ افسوس ہے کہ آجکل بدوں انگریزی نظیر اور مثال کے خدا کو بھی نہیں مانتے۔ یہ حالت ہے ہمارے اعتقاد کی پھر عملی حالت کا تو کیا پوچھنا وہ تو اور بھی زیادہ گندی ہے اور آجکل جو طاعون سے زیادہ پریشانی ہے اس کا سبب بجز اس کے کیا ہے کہ لوگوں کے اعتقاد درست نہیں چنانچہ بڑی وجہ ظاہر میں یہ ہے کہ موت سے ڈر ہے اور موت سے ڈر کیوں ہے کچھ تو طبعی امر ہے مگر زیادہ تر اس خوف کا سبب یہ ہے کہ موت کے متعلق لوگوں کے عقائد صحیح نہیں۔ اگر موت کے متعلق عقیدہ درست کرلیا جائے اور حقیقت موت کا بار بار مراقبہ کیا جائے تو یہ خوف بہت کم ہو جائیگا۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مرکر آدمی ایک گڑھے میں اکیلا جا پڑتا ہے اور تمام لذات سے محروم ہو جاتا ہے سو یہ بالکل غلط ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو موت کی حقیقت بھی معلوم نہیں یاد رکھو کہ موت صرف جسم عنصری کو آتی ہے روح کو موت نہیں آتی۔ بلکہ موت سے صرف اس کا تعلق جسم عنصری سے منقطع ہو جاتا ہے اب اس کے بعد یہ سمجھو کہ لذات سے منتفع ہونے والا کون ہے کیا آپ کے نزدیک یہ بدن ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح منتفع و متلذذ ہوتی ہے اور جسم اس کیلئے بمنزلہ آلہ و مرکب کے ہے اور یہ روح موت کے بعد بھی علیٰ حالہ باقی رہتی ہے بلکہ اب اس کی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے تو موت کے بعد وہ اس عالم کے لذات سے متلذذ ہوتی ہے اور اگر تم یہ سمجھو کہ میری حقیقت تو محض جسم ہی ہے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی گدھے پر سوار ہو کر یوں سمجھے کہ میں گدھا ہوں سو اس کا تو کوئی علاج نہیں۔ صاحب آپ کی حقیقت وہ ہے جس کو آپ میں سے تعبیر کرتے ہیں کہ میں نے یہ کیا میں نے وہ کیا اب آپ غور کیجئے کہ اس میں کا مصداق کیا چیز ہے کیا آنکھ ناک یا منہ اور ہاتھ پیر کو میں کا مصداق

کہہ سکتے ہو ہرگز نہیں۔ ورنہ چاہیے کہ ان اعضاء کے جاتے رہنے سے انسان ہی جاتا رہے اور یہ غلط ہے۔ رہے اور اعضاء شریفہ اور قوئ شریفہ جیسے قلب اور عقل وغیرہ ممکن ہے کہ آپ ان کو میں کا مصداق کہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اس کا مصداق نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ ان کو اپنی طرف مضاف کرتے ہیں کہ میرا دل کمزور ہو گیا۔ یا میری عقل میں یوں آتا ہے وغیرہ وغیرہ اور اضافت علامت مغائرت ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی آپ کی حقیقت نہیں بلکہ حقیقت آپ کی روح ہے اور گو وہاں بھی اضافت ہوتی ہے کہ میری روح مگر چونکہ مستقل دلائل سے ثابت ہے کہ یہی حقیقت ہے اس لئے یہ اضافت مجازیہ ہے اور دوسرے اعضاء و قوئ میں ایسی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلاف پر دلیل قائم ہے چنانچہ ایک زمانہ میں یعنی بالکل بچپن میں عقل نہیں ہوتی اور آپ ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں یعنی بعد موت قلب نہ رہیگا اور آپ رہیں گے صاف دلیل ہے کہ آپ کی حقیقت یہ چیزیں نہیں۔ اس لئے یہ اضافت حقیقیہ ہے بہرحال آپ کی حقیقت روح ہے اور اس پر موت نہیں آتی۔ بلکہ وہ بجنسہ موت کے بعد اپنے حال پر رہتی ہے اور اب بجائے اس جسم کے جو موت کے بعد فنا اور شکستہ ہو جاتا ہے روح کا مرکب دوسرا جسم بنتا ہے جس کو جسم مثالی کہتے ہیں اب روح اس جسم کے ذریعہ سے سارے انتفاعات وتلذذات حاصل کرتی ہے اور یہ جسم مثالی وہ نسمہ ہے جس کو متکلمین اہل ظاہر روح کہتے ہیں یعنی موت کے وقت جو چیز جسم عنصری سے الگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے وہ نسمہ ہے اور یہ بھی مادی چیز ہے مگر اس کا مادہ لطیف ہے اور اس کو اس جسم عنصری کے ساتھ ایسا حلولی تعلق ہے جیسا جسم تعلیمی کا تعلق جسم طبعی کے ساتھ حکماء نے بیان کیا ہے یعنی وہ نسمہ مقدار اور ہیئت وشکل میں بالکل جسم عنصری کے برابر ہے (اور وجہ تشبیہ یہی ہے۔ ورنہ جسم تعلیمی تو عرض ہے اور یہ جوہر) اور یہ نسمہ اس وقت یعنی زندگی میں اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے اور موت کے وقت الگ ہو جاتا ہے۔ یہی جسم مثالی ہے جو موت کے بعد روح حقیقی کا مرکب بنتا ہے اور یہ جسم مثالی گو مادی ہے مگر اس جسم سے زیادہ لطیف وقوی ہے اور روح حقیقی جو حقیقت میں انسان ہے وہ مادہ سے بالکل مجرد ہے ورنہ اس وقت جسم کے اندر ہے نہ موت کے وقت اس سے الگ ہو۔ بلکہ وہ تو محض جسم کی مُدبّر ہے جواب بھی بدن سے الگ ہی ہے اور اس کی تدبیر کر رہی ہے اور

گو متکلمین نے روح کے تجرد کا انکار کیا ہے مگر اس بارہ میں فلاسفہ کا قول راجح ہے۔ دلائل سے قوت انہی کے قول کو ہے۔ اور صوفیہ کا کشف بھی اسی کے موافق ہے کہ روح حقیقی مادہ سے مجرد ہے۔ البتہ فلاسفہ کا اس کو قدیم کہنا جیسا قدمار کا قول ہے یا حادث بعد حدوث البدن کہنا جیسا مشائین کا قول ہے یہ بالکل غلط اور خلاف نصوص ہے اور متکلمین نے جس چیز کو روح سمجھ کر مادی کہا ہے وہ دراصل روح حقیقی نہیں۔ بلکہ نسمہ ہے جو مرکب روح ہے غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان میں جو اصل چیز ہے اور حقیقت میں وہی انسان ہے موت کے بعد وہ اپنے حال پر رہتا ہے اس کی قوت وصفات میں کچھ کمی نہیں آتی۔ بلکہ پہلے سے کچھ ترقی ہی ہو جاتی ہے اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ گو روح کو موت نہیں آتی مگر جسم سے تو تعلق منقطع ہو جاتا ہے تو جو انتفاعات روح سے تنہا نہیں ہو سکتے وہ تو اب نہ ہو سکیں گے اس کا جواب بھی معلوم ہو گیا کہ موت کے بعد جسم مثالی مرکب بنتا ہے جو اس جسم عنصری سے لطیف اور قوی تر ہے وہ سب لذات سے متمتع ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں یہاں کی لذات ہیچ ہیں۔ میں نے رسالہ شوق وطن میں ثابت کر دیا ہے کہ یہاں کی سب نعمتیں اس عالم میں موجود ہیں اور روح ان سے متلذذ ہے۔ کھانا بھی پینا بھی سیر و تماشا بھی۔ ملاقات احباب بھی مکانات اور باغات بھی وغیرہ وغیرہ اس حقیقت کا مراقبہ کر کے موت کا دھیان کرو۔ تو انشاء اللہ موت سے وحشت نہ ہو گی۔ بلکہ اس کا شوق پیدا ہو گا۔ اور یوں کہو گے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔۔۔ راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ۔۔۔ تا درِ میکدہ شاداں وغزلخواں بروم

بہر حال موت حقیقت میں ڈرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ تو تحفۃ المومن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مومن کا تحفہ فرما رہے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ موت دراصل رغبت کی چیز ہے۔ گھبرانے کی چیز نہیں اور جو کچھ گھبراہٹ ہے اس کا زیادہ سبب موت کی حقیقت سے جہل وغفلت ہے اگر موت دراصل خوف وگھبراہٹ کی چیز ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تحفہ نہ فرماتے پھر کوئی تو بات ہے جو آپ اس کو تحفہ فرما رہے ہیں یہ تحفہ تو وہ حالت ہے جو عین موت کے وقت ظاہر ہو گی۔ پھر موت کے بعد جو عیش ہو گا وہ اس کے علاوہ ہے اور درمیان میں عالم برزخ میں

جو راحت ہوگی کہ مومنین کی ارواح حواصلِ طیرِ خضر میں اِدھر اُدھر کھاتی پھریں گی وہ الگ ہے ان سب باتوں کو سوچو تو انشاء اللہ موت سے وحشت و گھبراہٹ نہ رہے گی۔ ہاں البتہ ایک بات رہ گئی جس کی وجہ سے عارفین اہل اللہ کو بھی موت سے پریشانی ہوتی ہے وہ یہ کہ اپنے گناہوں سے اندیشہ ہوتا ہے کہ مرتے ہی کہیں ان پر گرفت اور مواخذہ نہ ہونے لگے اور گناہ بھی ایک دو نہیں بلکہ ایک بڑا انبار ہے جس کی یہ حالت ہے ؎

یک تن و خیل آرزو دل بچہ مدعا دہم　　　تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

یہ فکر البتہ بہت سخت ہے اور یہ فکر اچھی بھی ہے۔ یہ تو ضرور ہونا چاہئے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس فکر کو طاعون ہی کے ساتھ کیا خصوصیت ہے یہ تو ہر مرض میں ہونا چاہئے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ گناہوں کی فکر سے دوسرے امراض میں اس قدر وحشت نہیں ہوتی جتنی طاعون میں ہوتی ہے حالانکہ طاعون میں اگر سچ پوچھو تو طبعاً بھی وحشت کم ہونا چاہئے کیونکہ مثل مشہور ہے اور امر طبعی بھی ہے کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد اور عربی مثل ہے البلیۃ اذا عمت طابت کہ بلا جب عام ہو جاتی ہے خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ موتِ جماعت موتِ وحدت سے اہون ہونا چاہئے مگر نہ معلوم یہاں یہ طبعی امر برعکس کیوں ہے کہ موتِ وحدت سے گھبراہٹ نہیں ہوتی اور مرگِ انبوہ سے گھبراہٹ ہوتی ہے اگر کہا جاوے وحشت اس لئے ہے کہ اس میں مہلت نہیں ہوتی تو اور بھی بعض اسباب موت ایسے ہیں۔ جیسے ہدم و غرق مگر ان میں اس درجہ وحشت نہیں بہرحال اس کی حقیقت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اور ایسی بہت باتیں ہیں جن کی حقیقت کا علم ہم کو نہیں مگر وقوع مشاہد ہے۔ جیسا کہ چند روز سے میرے دل میں یہ سوال آ رہا ہے۔ کہ گدگدی کا سبب کیا ہے، ذرا سارے رخام جمع ہو کر مجھے اس کا سبب بتلائیں اگر معقول سبب کسی نے بتلا دیا تو میں اُس کی شاگردی قبول کر لونگا۔ رقم تو میرے پاس ہے نہیں جو کچھ انعام دوں اگر گدگدی کا سبب حرکت غریبہ کو بتلایا جائے تو اس کی کیا وجہ ہو کہ ویسی ہی حرکت غریبہ اپنے ہاتھ سے کی جائے تو گدگدی کیوں نہیں اٹھتی۔ دوسرے ہی کے ہاتھ سے کیوں اٹھتی ہے اسی طرح یہ بھی اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ طاعون میں مرگِ انبوہ سے وحشت کیوں ہوتی ہے خیر یہ تو ایک طبعی امر ہے کہ طاعون سے گھبراہٹ ہوتی ہے مگر امور طبعیہ بھی علاج و تدبیر سے اور

عقل سے کام لینے سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ جیسے کڑوی دوا طبعاً ناگوار ہوتی ہے مگر عقلی مقدمات
کے سوچنے سے ناگواری کم ہو جاتی ہے۔ نشتر لگوانے میں کتنی سخت تکلیف ہوتی ہے مگر عقل سے
کام لیکر نشتر کو گوارا کرتے ہیں اور بعض دفعہ بدون کلورافارم سونگھے ہوئے بھی نشتر لگوا لیتے ہیں۔ کیونکہ
کلورافارم سونگھنے سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اس معاملہ میں عقل سے کام لیکر اس وحشت
وگھبراہٹ کو کم کرنا چاہیے جو آج کل اس بیماری کی وجہ سے ہو رہی ہے آخر خدا تعالیٰ نے عقل
کس واسطے دی ہے جیسے ایک بیرسٹر کا کہ اس وقت وزیر تھے۔ قصہ میں نے سنا ہے کہ اُن
کے والد صاحب کے انتقال کی خبر آئی۔ آپ نے وقت پر باورچی سے کہا کہ کھانا لاؤ۔ اس نے
کہا حضور آج تو میں نے کھانا نہیں پکایا۔ پوچھا کیوں؟ کہا کہ آج جناب کے قبلہ وکعبہ کے انتقال
کا تار آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ صدمہ کی وجہ سے آج کھائیں گے تھوڑا ہی تو فضول کیوں پکاؤں
مسٹر صاحب نے کہا سبحان اللہ وہ تو اپنی موت سے مرے۔ اور ہم اپنے ہاتھوں ہلاک ہوں
کر بھوکے مریں۔ جاؤ کھانا پکاؤ۔ اور پانچ روپیہ جرمانہ کہ بدوں دریافت کئے تم نے اپنی رائے
سے کھانے میں دیر کی۔ اس کے بعد آپ نے تعزیت کی ایک مثل تیار کرائی۔ اُن کے یہاں
ہر کام کی باضابطہ مثل تیار ہوتی تھی۔ تعزیت کیلئے بھی تیار کی گئی۔ جس میں یہ لکھا جاتا کہ آج
فلاں شخص آیا اس نے والد صاحب مرحوم کی تعزیت اس طرح کی۔ ہم نے اس کا یہ جواب دیا۔
پھر اس مثل کے لئے آپ نے ایک میعاد مقرر کر رکھی تھی۔ جب وہ میعاد ختم ہو گئی تو مثل داخل دفتر
کر دی گئی۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص آتا اور تعزیت کیلئے کچھ کہنا چاہتا تو آپ پہلے ہی سے اُس کو
یہ کہکر روک دیتے کہ شاید آپ والد صاحب کی تعزیت میں کچھ کہنا چاہتے ہیں سو اُس کی مثل داخل
دفتر ہو گئی ہے۔ اب میں اُس کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ گو اس شخص کو انتظام میں غلو ہو گیا
تھا۔ مگر منشا اس فعل کا اچھا تھا۔ اور اس منشا ہی کی قدر کرتا ہوں۔ جیسے حضرت جنیدؒ نے ایک
چور کے جو پھانسی پر لٹکا ہوا تھا پیر چومے تھے۔ لوگوں نے اعتراض کیا۔ فرمایا میں نے چور کے
پیر نہیں چومے۔ بلکہ اُس کے استقلال کے پیر چومے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے مطلوب پر مرتے
دم تک جما رہا حتی کہ اس پر جان دیدی۔ اور یہ حال ہوا کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید ۔۔۔ یا تن رسد بجاناں یا جان زتن برآید

اور یہ استقلال وصف محمود ہے جس کو اس شخص نے محل مذموم میں صرف کیا اس لئے نشانۂ ملامت ہوا۔ اگر ہم لوگ محبوب حقیقی کی طلب میں ایسا استقلال حاصل کر لیں جیسا اس چور کو چوری میں حاصل تھا۔ تو ہمارا کام بن جائے۔ اسی طرح میں اس مسٹر کے ان سب افعال کی مدح نہیں کرتا بلکہ ان افعال کے منشا کی قدر کرتا ہوں۔ گو ان افعال کی ذات اچھی نہ تھی مگر ان کا منشا اچھا تھا کہ انہوں نے عقل کو طبع پر غالب کر لیا تھا۔ اس لئے نہ تو والد کے انتقال کے دن کھانا چھوڑا نہ مہینوں تک تعزیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ کہ اس سے خواہمخواہ عرصہ تک زخم تازہ رہتا ہے بلکہ ایک میعاد مقرر کر کے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ غرض امور طبعیہ کو مغلوب کرنے والی چیز ایک تو عقل ہے اس سے کام لو۔ اور دوسری چیز دین ہے اس کو غالب کرو۔ اگر دینداری حاصل ہو تو پھر موت سے بجائے وحشت کے محبت ہو جائے کیونکہ دین کی ترقی سے اللہ تعالیٰ کے لقاء کا اشتیاق غالب ہوتا ہے اور اشتیاقِ لقاء سے موت کا اشتیاق ہوتا ہے کیونکہ وہ ذریعہ لقاء اللہ ہے اور سب کا میزان الکل محبت ہے۔ اگر حق تعالیٰ سے محبت ہو جائے تو پھر موت سے یا طاعون اور بیماری سے کبھی وحشت نہ ہو اور یہ میزان الکل اس لئے ہے کہ عقل اور دین دونوں اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ دین تو محبت الٰہی کا امر کرتا ہی ہے مگر عقل بھی اس کا امر کرتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ شانہ منعم و محسن ہیں اور محسن کی محبت عقل کا مقتضے ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ محبتِ حق سے زیادہ کوئی چیز پریشانی کو کم کرنے والی نہیں ہے ہم کو ساحران موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے سبق لینا چاہیے کہ نومسلموں کی تو یہ کیفیت کہ اسلام لاتے ہی موت کے مشتاق اور لقاءِ حق کے متمنی ہو گئے اور موت سے ایسے نڈر ہوئے کہ فرعون کی دھمکیوں کی ذرا پروا نہیں کی۔ اور ہم پرانے مسلمان جو صدیوں سے مسلمان چلے آتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد صدیوں سے مسلمان ہیں اور اس کا بڑا اثر ہوتا ہے کہ جو صفت نسل میں چلی آتی ہو اس میں فطرۃً خاص ملکہ ہوتا ہے۔ چنانچہ عالم کے بیٹے کو عالم بننا آسان ہوتا ہے اور طبیب کے بیٹے کو طبیب بننا سہل ہے اور معمار کے بیٹے کو معمار بننا اور نجار کے بیٹے کو نجار بننا۔ غرض جو کام خاندان میں عرصہ سے ہوتا آ رہا ہو اس سے خاندان والوں کو خاص مناسبت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے آباؤ اجداد میں صدیوں سے جب اسلام چلا آ رہا ہے۔ تو ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ نومسلموں سے

زیادہ تعلق ہونا چاہیے تھا۔ یہی توجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قرآن میں بہت لتاڑا ہے کیونکہ اُن کے خاندان میں نبوت و علم و معرفت صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ حالانکہ بعض معاملات خود مخاطبین کے ساتھ نہیں ہوئے۔ بلکہ اُن سے پہلے اُن کے آبا و اجداد کے ساتھ ہوئے ہیں۔ مگر اُن کے ذکر سے ایک مطلب یہ ہے کہ تم میں اثر طاعات کا زیادہ ہونا چاہیے اور دوسرا تم پرانے نمک خوار ہو۔ ہم نے تمہارے آبا و اجداد پر ایسے ایسے انعامات کئے۔ تم پر دوسروں سے زیادہ ہماری محبت کا اثر ہونا چاہیے تھا۔ اسی قاعدہ کے مطابق ہم پر بھی ساحرانِ موسیٰ سے زیادہ محبت کا اثر ہونا چاہیے تھا مگر افسوس کہ ہم اُن نومسلموں سے بھی گئے گزرے۔ شاباش ہے اُن نومسلموں کو کہ فرعون نے جب اُن کو یہ دھمکی دی ہے لَاُقَطِّعَنَّ ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاصلبنکم فی جذوع النخل ولتعلمن اینا اشد عذابا وابقی ۝ تو انہوں نے نہایت دلیری سے جواب دیا۔ قالوا لن نؤثرک علی ماجآءنا من البینٰت والذی فطرنا فاقض ما انت قاض ط انما تقضی ھذہ الحیوۃ الدنیا انا آمنا بربنا لیغفر لنا خطایانا و ما اکرھتنا علیہ من السحر ط واللہ خیر وابقی ط ۝ انہ من یات ربہ مجرما فان لہ جھنم لا یموت فیھا ولا یحییٰ ط ومن یاتہ مؤمنا قد عمل الصلحت فاولئک لھم الدرجات العلیٰ یعنی ہم کو سولی یا پھانسی کا ڈر نہیں۔ ہم تجھے خدا تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ہرگز ترجیح نہ دیں گے تجھ سے جو ہو سکے کر لے اور تو کر ہی کیا سکتا ہے صرف اس دنیوی زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے ہیں۔ تاکہ ہمارے گناہ معاف فرما دیں خصوصاً گناہ سحر جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا تھا اور اس ایمان و مغفرت سے حیات جاوید ہم کو حاصل ہو گی۔ اور اللہ تعالیٰ بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے (اس کی عطا بے زوال ہے) اور دوسری جگہ ساحرانِ موسیٰ کا یہ جواب بھی مذکور ہے۔ قالوا لاضیر انا الی ربنا منقلبون ط اس میں اہل لطائف نے کہا ہے کہ انا الی ربنا منقلبون ۝ علت ہے لاضیر کی مطلب یہ ہے کہ ہم کو سولی وغیرہ سے کچھ ضرر نہیں کیونکہ ہم (اس کے بعد) اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جائیں گے جس کے پاس جانے کے ہم مشتاق ہیں۔ مگر خودکشی حرام ہے اس لئے ہم خود تو جلدی سے خدا تعالیٰ کے پاس نہیں پہنچ سکتے۔ اچھا ہے تو ہی قتل کر کے ہمیں جلدی پہنچا دے

سبحان اللہ ان لوگوں کا کیسا کامل ایمان تھا کہ مسلمان ہوتے ہی لقاء حق کے ایسے مشتاق ہو گئے اور حیات دنیا کی قدر ان کی نگاہ سے فوراً اُتر گئی۔ صاحبو! یہ محبت اور شوق پیدا کرو۔ اس سے ساری پریشانیاں دفع ہو جائیں گی۔ اس وقت میں اسی کا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہیں کہتا۔ نہ میں طاعات کو کہوں نہ ترک معاصی کو۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک دن میں جنید بغدادی نہیں ہو سکتے۔ لیکن خدا کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ اگر آپ میرے بتلائے ہوئے طریقہ پر عمل کریں تو انشاء اللہ تعالیٰ دو ہی دن میں خدا کے عاشق تو ضرور ہو جائیںگے پھر طاعات اور ترک معاصی کا کام آپ خود کریں گے میں تو اس وقت جڑ لگاتا ہوں پھول اس پر خود بخود پیدا ہو جائیں گے اور وہ جڑ محبت ہے اس کو حاصل کر لو پھر طاعات خود بخود ہونے لگیں گی اور اسوقت آپکو طاعات سے وحشت نہ ہوگی بلکہ انکا خود شوق ہوگا اور ایسی لذت آئیگی کہ بعض دفعہ اس لذت کے آثار سے استغفار کرنا پڑیگا شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ کیسے ہوگا کہ لذت طاعات سے استغفار کرنا پڑیگا تو بات یہ ہے کہ بعض دفعہ طاعات میں لذت آکر عجب ہونے لگتا ہے اور دوسروں کی جو طاعات سے محروم ہیں تحقیر قلب میں آنے لگتی ہے اس سے اہل اللہ استغفار کرتے ہیں۔ اور بعض دفعہ خود لذت سے استغفار کرتے ہیں گو اس پر یہ آثار مرتب بھی نہ ہوں۔ کیونکہ لذت طاعات بھی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالغیر ہے عارف کو بعض دفعہ شبہ ہو جاتا ہے کہ کہیں میں تہجد اور ذکر اس لذت ہی کے واسطے نہ کرتا ہوں اس لئے وہ اس لذت پر التفات کرنے سے بھی استغفار کرتے ہیں اب سمجھ میں آگیا ہوگا وبالاسحار ھم یستغفرون کا ربط کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون سے ظاہر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رات کو تہجد پڑھنے سے استغفار بالاسحار کو کیا تعلق ہے بعض مفسرین نے تو یہ کہا کہ وہ معاصی سے استغفار کرتے ہیں اور اسحار کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ وقت اجابتِ دعا کا ہے۔ اور تہجد سے استغفار کا تعلق یہ ہے کہ وہ جلب منفعت ہے اور یہ دفع مضرت ہے اور بعض نے کہا کہ وہ تہجد پڑھ کر اس طاعت ہی سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ طاعات بھی معاصی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ زیادہ سہل اور ظاہر یہ ہے کہ وہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں اور اخیر شب میں لذت طاعات سے یا اس لذت کے آثار سے استغفار کرتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت یہ حال ہوتا ہے ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

اور وصل کی لذت جیسی ہوتی ہے معلوم ہے۔ اس لذت میں کبھی انہماک ہو کر اسکی مقصودیت کا شبہ ہو جانا بعید نہیں۔ اور اس دولت وصل سے مشرف ہو کر عجب کا پیدا ہو جانا بھی عجیب نہیں۔ اس لئے اس سے استغفار کرتے ہیں۔ شاید یہاں کوئی صاحب یہ شبہ کریں کہ جب طاعات کے آثار لذت سے بھی استغفار کرنا پڑتا ہے۔ تو ہم ہی اچھے رہے کہ طاعات ہی نہیں کرتے جو عجب وغیرہ پیدا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شبہ جہالت کا ہے کیونکہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ مقاصد کے ساتھ اگر معاصی اور مفاسد کا انضمام ہو جائے تو مقاصد کو باقی رکھکر مفاسد کا علاج کیا جاتا ہے اور اگر امور زائدہ غیر مقصودہ کے ساتھ مفاسد کا انضمام ہو جاتا ہے تو زوائد ہی کو حذف کر دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ طاعات مقاصد میں سے ہیں اس لئے ان کو حذف نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان کو باقی رکھکر مفاسد کا علاج کیا جائیگا۔ بات دور پہنچ گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ محبت حاصل ہونے کے بعد طاعات اور ترک معاصی کو آپ خود اختیار کریں گے اور شوق کے ساتھ اختیار کریں گے۔ اس سے کسی قسم کی گرانی طبیعت میں نہ ہوگی، یہ تو دین کا نفع ہوا۔ اور دنیا کا نفع یہ ہوگا کہ محبت سے تمام پریشانیاں دفع ہو جائیں گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کے بعد آپ کو بیماری نہ ہوگی۔ یا کوئی تکلیف پیش نہ آئیگی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وقت حوادث کا رنگ دوسرا ہوگا اُس وقت آپ کو ان کلفتوں میں بھی حظ آئیگا۔ کیونکہ ع

از محبت تلخہا شیریں شود

دوسرے محبت کے ساتھ جب معرفت حاصل ہوگی تو کلفت اور مصیبت کے اندر بھی نعمتوں کا انکشاف ہوگا۔ اور اُن میں اسرار و حِکَم معلوم ہونگے اور ظاہر ہے کہ جب کلفت کے ساتھ کوئی عظیم الشان نعمت بھی حاصل ہو جائے تو کلفت کلفت نہیں رہتی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ سخت مرض میں مبتلا تھے اور ساتھ میں زخمی بھی تھے کوئی جگہ زخم سے خالی نہ تھی وہ زمین پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے زخموں پر مکھیاں بھن بھن کر رہی تھیں ایک دوسرے بزرگ وہاں سے گزرے تو انہوں نے پہچانا کہ صاحب نسبت اور عالی مقام ہیں وہ خدمت کیلئے ان کے پاس آ گئے اور پنکھا جھلنے لگے اُن کو افاقہ ہوا تو گھبرائے اور

فرمایا یہ کون شخص ہے جو مجھ میں اور میرے محبوب میں حائل ہو گیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میں خدمت کیلئے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا نہیں مجھے اسکی ضرورت نہیں تم اپنے کام میں لگو اور مجھے اور میرے محبوب کو چھوڑ دو۔ بتلایئے اس شخص کو اس تکلیف میں کچھ تو لذت تھی جو دوسرے کی خدمت اور راحت رسانی گوارا نہ ہوئی۔ بلکہ تکلیف میں پڑا رہنا ہی پسند ہوا تو بات یہ ہے کہ مصیبت میں بھی اسرار و حکم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مصیبت مصیبت نہیں رہتی بلکہ لذیذ ہو جاتی ہے۔ میں اس کی چھوٹی سی نظیر اپنا ہی واقعہ بیان کرتا ہوں اور گو مجھے بزرگوں سے کیا نسبت گر اُن کی جوتیاں سیدھی کرنے سے اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کو تحدث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس سال آنت کے درد کی سخت تکلیف ہوئی۔ کلفت تو بعض وقت ایسی ہوتی تھی جیسی نزع میں سنی جاتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قلب کو اپنے ساتھ متعلق کر کے اس کلفت کو آسان کر دیا۔ پھر اس میں جو حکمت معلوم ہوئی تو اس نے تو کلفت کو عقلاً لذیذ کر دیا۔ پھر جب جسمانی کلفت جاتی رہی اور صرف عذر رہ گیا تو وہ عقلی لذت طبعی فرحت بن گئی وہ حکمت یہ ہے کہ مجھے سفر سے بہت کلفت تھی۔ کچھ تو طبعاً مجھے سفر سے انقباض ہے اور کچھ اس لئے انقباض بڑھ گیا کہ سفر میں بد مذاق لوگوں سے پالا پڑتا ہے اس کے لئے دوستوں سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ کہ ایسی کیا تدبیر کی جائے۔ جس سے لوگ مجھے سفر سے معافی دیں کیونکہ اب مجھے سفر کا تحمل نہیں ہے۔ مگر کوئی صورت ایسی نہ نکلتی تھی طبعی انقباض کو تو کون عذر سمجھتا ہے۔ ویسے ظاہر میں بوجہ صحت و سلامت اسباب کے کوئی عذر تھا ہی نہیں اس لئے احباب سفر پر مجبور کرتے ہی تھے اب حق تعالیٰ نے غیب سے یہ عذر پیدا کر دیا۔ اب جہاں کہیں کوئی مجھے بلاتا ہے میں یہ عذر کر دیتا ہوں کہ حرکت شدیدہ سے جیسے کھانسی یا چھینک یا آواز بلند بات کرنا یا ناک صاف کرنا اس سے کمانی اونچی ہو کر آنت باہر آجاتی ہے جس سے مجھکو ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہے جب تک فوراً درست نہ کیا جاوے جس کیلئے خلوت کا موقعہ درکار ہوتا ہے اور سفر میں یہ سب امور اختیار سے باہر ہیں۔ اس لئے میں سفر سے معذور رہوں۔ اس سے مخاطب فوراً لاجواب ہو جاتا ہے بس جہاں آنت کا نام لیا اور دوسروں کے دانت کھٹے ہوئے۔ پھر وہ سفر پر اصرار کر ہی نہیں سکتے تو اس کلفت میں یہ حکمت حق معلوم ہو کر مجھے اس قدر راحت ہے جس میں

بیان نہیں کر سکتا۔ اب اگر کوئی اس قسم کا خط آتا ہے کہ ہم نے فلاں شخص سے سنا ہے آپ کو تکلیف ہے تو میں جواب میں لکھدیتا ہوں صَدَقَ وَکَذَبَ یعنی عذر کے بیان میں تو راوی سچا ہے لیکن تکلیف کی روایت میں غلط کار ہے۔ کیونکہ مجھے اس عذر سے الم و پریشانی نہیں ہوئی بلکہ حظ حاصل ہوتا ہے بہر حال محبت وہ چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر پریشانی کو دور کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ اب میں محبت حاصل کرنے کا طریقہ بتلاتا ہوں جس کے صرف دو جزو ہیں۔ حکیم محمود خاں کے نسخہ میں دو ہی جزو ہوتے تھے اور یہی کمال ہے کہ نسخہ کے اجزا قلیل ہوں اور نفع زائد ہو۔ یہ نہیں کہ قرابادین کے برابر نسخہ لکھدیا جیساکہ شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ جب سکندرآباد پہنچے تو سفر کی وجہ سے طبیعت کچھ ناساز ہوگئی۔ آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ یہاں کوئی طبیب بھی ہے لوگوں نے ایک معمولی طبیب کا نام بتلایا۔ شاہ صاحب نے اُن کو بلایا۔ وہ بڑے خوش ہوئے کہ مجھے اتنے بڑے شخص نے یاد کیا۔ اور میں اُن کا معالج ہو کر بہت مشہور ہوجاؤنگا۔ چنانچہ آئے اور نبض دیکھکر نسخہ اتنا بڑا لکھا کہ پوری قرابادین ہوگئی۔ مولوی حیدر علی صاحب جو حکیم بھی تھے اور شاہ صاحب کے شاگرد بھی اور رفیق سفر بھی تھے۔ نسخہ کو دیکھکر ہنسنے لگے اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت یہ کوئی جاہل معلوم ہوتا ہے آپ اس کا نسخہ استعمال نہ فرمائیں۔ فرمایا نہیں بھائی شفا تو حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور یہ تو محض سبب ظاہری ہے تم اسی نسخہ کو منگواؤ۔ چنانچہ منگوایا گیا۔ ایک بڑا دیگچہ دواؤں ہی سے بھر گیا۔ اور شاہ صاحب نے اس کو نوش فرمایا۔ مگر یہ ہمت پہلے ہی بزرگوں کی تھی۔ آجکل ایسی ہمت کہاں اس لئے آجکل نسخہ میں تھوڑے ہی اجزا ہونے چاہئیں۔ چنانچہ میں بھی اس وقت صرف دو باتیں بتلاتا ہوں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کیا کرو اس سے محبت پیدا ہوگی۔ کیونکہ نعمت میں خاصہ ہے جذب کا منعم کے احسانات کو یاد کرکے خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے دوسری بات یہ کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو۔ اس کو دخل عظیم ہے محبت پیدا ہونے میں اس کے بعد پھر انشاءاللہ طاعون یا وبا کا خوف دل میں اصلا نہ رہیگا۔ بلکہ موت کے مشتاق ہو کر یوں کہو گے ؎

اقتلونی اقتلونی یا ثقات ان فی قتلی حیاتاً فی حیات

یہ شعر اصل میں منصور کا ہے جب وہ سولی پر چڑھانے کیلئے بڑھائے گئے تو یوں کہتے جارہے تھے ؎

اقتلونی یا ثقاتی ان فی قتلی حیاتی

غلبۂ محبت کے بعد موت کا اشتیاق بھی غالب ہو جاتا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جس دن صبح کو شہید ہونے والے تھے اس کی رات میں آپ کو مکشوف ہو گیا تھا کہ کل کو شہادت کا دن ہے تو رات کو آپ کی یہ حالت تھی کہ غسل کر کے عمدہ کپڑے پہنے۔ خوشبو لگائی۔ اور وصال حق کیلئے تیار ہو گئے۔ اور جب باہر تشریف لاتے ہیں تو بار بار یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

سر جدا کرد از تنم یارے کہ با ما یار بود قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

پھر یہ واقعہ ہوا کہ کچھ رافضی حاضر ہوئے۔ اور انہوں نے حضرات شیخین کے متعلق سوالات کئے آپ نے جواب دیئے۔ وہ جواب رافضیوں کے خلاف تھے کمبختوں نے آپ کو قرابین سے شہید کر دیا۔ آپ کی تیاری سے آپ کا اشتیاق ظاہر ہے (اس محبت میں یہ حالت ہوا کرتی ہے کہ موت کے لئے اس طرح تیاری کا شوق ہوتا ہے جیسے دولہا شب زفاف کے لئے تیاری کرتا ہے) ہاں شاید عقلاء کو اس کے ساتھ یہ خوف بھی ہو گا کہ دیکھئے کہیں گناہوں کی وجہ سے عتاب میں نہ پکڑے جائیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عاشق کے گناہوں کی بھی دوسری شان ہوتی ہے عاشق کا جرم دوسروں کے جرم کی طرح نہیں ہوتا اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک بخاری غلام صدر جہاں کا ملازم تھا اور صدر جہاں کا عاشق بھی۔ ایک دن کچھ خطا ہو گئی تو خوف سے بھاگ گیا۔ صدر جہاں کو بڑا غصہ آیا آدمی تلاش کیلئے بھیجے۔ کہیں پتہ نہ لگا۔ چند روز کے بعد وہ خود ہی آیا تو لوگوں نے صدر جہاں کے غصہ سے بہت ڈرایا اور صلاح دی کہ کہیں چلدے مگر وہ بخاری عشق سے بے چین تھا۔ آہی کھڑا ہوا۔ اور سامنے آتے ہی بیہوش ہو کر قدموں میں گر پڑا۔ صدر جہاں کو یا تو غصہ آرہا تھا یا اس حالت کو دیکھ کر رحم آگیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ اور فوراً غلام کا سر قدموں سے اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا

اور بخلہ مُنگھانے اور پنکھا جھلنے لگا۔ آخر یہ کس بات کا اثر تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ وہ غلام مجرم ہونے کے ساتھ آقا کا عاشق بھی تھا۔ عشق کی وجہ سے آقا کی صورت دیکھکر اور اپنے جرم کو یاد کر کے بیہوش ہو گیا۔ بس یہی حالت محبت کے بعد تمہاری ہو جائیگی۔ کہ تمہاری خطاؤں کا اور ہی رنگ ہو جائے گا۔ دوسرے مان بھی لو کہ کچھ دنوں کیلئے جہنم ہی میں جانا پڑیگا۔ تو پھر یہی عقلی قاعدہ یہ ہے کہ جو تکلیف منقطع ہونے والی ہوتی ہے وہ ہلکی ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کا عذاب یقیناً ایک نہ ایک دن منقطع ہو گا۔ اس لئے بعد کی حالت کو یاد کر کے اور جنت میں جانے کی امید سے یہ کلفت سہل ہو جائیگی۔ تیسری بات اور ہے میں اس کو کیوں چھپاؤں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں چھپائی وہ یہ کہ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے کہ جو مسلمان جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ حق تعالیٰ ان کو ایک قسم کی موت دیدیں گے اماتهم الله اماتة یہ الفاظ ہیں حدیث کے اس کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی موت تو نہ آئیگی۔ مگر کوئی حالت مشابہ موت کے ہو گی مثلاً یہ کہ جسم کو ایسا کر دیا جائے جیسا موت سے بیحس ہو جاتا ہے یا کم حس کر دیا جائے سو اب اس کو عذاب وغیرہ کا احساس ہی نہ ہو یا کم ہو۔ بہر حال مسلمانوں کا عذاب بھی دوسروں کے عذاب کی طرح نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مسلمان پل صراط سے گذریں گے جس کا راستہ جہنم کی پشت پر سے ہو گا تو جہنم مسلمانوں سے کہے گی جز یا مؤمن فان نورك اطفأ ناری اے مسلمان جلدی سے پار ہو جا تیرے نور کی ٹھنڈک نے تو میری آگ ہی کو بجھا دیا۔ جب پشت پر سے گذرنے کا یہ اثر ہے تو جب مسلمان جہنم کے اندر ہو گا اس وقت تو بھلا کیا حال ہو گا۔ کچھ عجب نہیں کہ برد ایمان کی وجہ سے نار جہنم اس پر اثر ہی نہ کرے یا اثر کرے اور اس کو احساس نہ ہو یا احساس ہو اور کم ہو گو وہ کم بھی خدا کی پناہ بہت کچھ ہے۔ میں ان باتوں سے معاصی پر جرأت نہیں دلاتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ موت سے جو آپ کو ایسی وحشت ہے کہ اس کے تصور سے بھی ڈرتے ہو اس کو دور کرو۔ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اپنے خدام سے تفریح و تفریع کیلئے دریافت کیا کہ کیوں بھائی آخرت میں بھی وہی خدا ہے جو یہاں دنیا میں ہے۔ سب نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا پھر تو انشاء اللہ تعالیٰ کچھ اندیشہ نہیں کیونکہ یہاں تو وہ بڑے مہربان ہیں۔ بس وہاں بھی ایسے ہی مہربان ہوں گے۔ میں کہتا ہوں بلکہ وہاں یہاں سے زیادہ مہربان ہونگے کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

دنیا میں رحمت کے سو حصوں میں سے ایک حصہ ظاہر کیا ہے اور آخرت میں پورے سو حصوں کے ساتھ مسلمانوں سے برتاؤ کریں گے۔ دیکھئے کیسی اچھی بات ہے کہ جب آخرت میں وہی خدا ہے جو دنیا میں ہے تو پھر ڈرنا کاہے کا۔ اور یہ اثر محبت کا تھا مولانا کو حق تعالیٰ سے محبت تھی اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ تم محبت کی ٹڑیا کھا لو پھر سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کے بعد تم پٹو گے نہیں۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پٹو گے بھی تو اس طرح پٹو گے جس طرح عشاق پٹا کرتے ہیں عشاق کو غیروں کی طرح نہیں پٹوایا کرتے بلکہ یوں ہی برائے نام کچھ سزا دیدیتے ہیں محبوب کو اُن کی محبت و عشق کی بھی لاج ہوتی ہے۔ دوسری ایک اور بات ہے گو کہنے کی نہیں مگر جب زبان پر آگئی تو کیوں چھپاؤں۔ وہ یہ کہ عاشق کو محبوب کے ہاتھ سے پٹنے میں بھی مزہ آتا ہے ضرب الحبیب زبیب۔ بلکہ محبوب کے سامنے پٹنے میں بھی مزہ آتا ہے۔ اسی کو ایک عاشق کہتا ہے ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست　　　تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

والعشاق بقتل بعضہم بعضاً۔ اس کی شرح میں ابن عطار نے ایک عاشق کا قصہ لکھا ہے کہ اُس کو کسی سے محبت تھی اس کی اطلاع محبوب کے اقارب و لواحق کو ہوئی تو انہوں نے اُس کے سو دُرے لگائے۔ ننانوے دروں تک تو اُس نے ایک بھی آہ نہ کی اُس کے بعد جو ایک درہ لگا تو اُس نے آہ کی۔ کسی نے ملامت کی کہ تو نے ننانوے دروں تک تو تحمل کر لیا اخیر میں ایک درہ کا تحمل نہ ہو سکا۔ کہنے لگا تجکو اس کا سبب معلوم نہیں۔ بات یہ ہے کہ ننانوے دروں تک تو محبوب مجھے اور میری اس حالت کو دیکھ رہا تھا۔ تو اس وقت مجھے یہ حظ آرہا تھا کہ ہاں محبوب دیکھ رہا ہے کہ اُس کی محبت میں میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جارہا ہے۔ اس حظ نے الم ضرب کو محسوس نہ ہونے دیا۔ جب ننانوے درے لگ چکے تو وہ چلا گیا۔ اُس وقت مجھے ضرب کا احساس ہوا اس لئے اخیر درہ پر آہ کی۔ اور گو یہ واقعہ عاشق مجازی کا ہے مگر عشق حقیقی اور مجازی کے بعض آثار متحد ہیں کیونکہ عشق تو دونوں جگہ مشترک ہے اس لئے ایک سے دوسرے کی تفسیر ہو سکتی ہے اور یہی تو وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا ہے واصبر لحکم ربک فانک باعیننا (اپنے رب کے فیصلہ پر صبر کئے رہو اور استقلال سے جمے رہو) کیونکہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ فانک باعیننا اسی واسطے بڑھایا ہے۔ تاکہ آپ پر کفار کی ایذائیں آسان ہو جائیں۔ اور ان سے بجائے کلفت

کے لذت حاصل ہو تبلا دیا کہ جو کچھ آپ کے ساتھ برتاؤ ہو رہا ہے۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں اس مراقبہ کا یہ اثر لازمی ہے کہ کلفت مبدل بہ لذت و راحت ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ سب سے بڑھ کر مکروہ اور ناگوار چیز موت ہے مگر عشاق کو وہ بھی لذیذ ہو جاتی ہے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردم　　راحتِ جاں طلبم وزپے جاناں بردم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا درِ میکدہ شاداں و غزلخواں بردم

ایک دوسرے بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مرنے لگے تو خوش ہو کر یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

وقتِ آں آمد کہ من عریاں شوم　　جسم بگذارم سراسر جاں شوم

رہا یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے متعلق قطعی دلیل تو سوائے حدیث و قرآن کے اور کیا ہو سکتی ہے اور حدیث و قرآن میں عام مسلمانوں کیلئے اور خصوصاً اہل محبت کیلئے جو کچھ بشارتیں وارد ہیں وہ ظاہر ہیں لیکن وہ عام ہیں کسی خاص شخص کے متعلق حدیث و قرآن میں تفصیل وارد نہیں کہ کس کے ساتھ کیا برتاؤ ہوا۔ (بجز چند صحابہؓ کے جن کے متعلق احادیث میں تعیین کے ساتھ بھی کچھ وارد ہے) ہاں خاص طور پر بزرگوں کے واقعات بہت منقول ہیں جو قطعی تو نہیں ہیں ظنی ہیں مگر حسن ظن اور پھر تواتر معنوی یہ کہتا ہے کہ وہ واقعات صحیح ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل محبت مرنے کے بعد بھی کیسے مطمئن ہوتے اور کس درجہ چین میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ نے مرتے ہوئے وصیت کی کہ میرے جنازہ کے ساتھ ایک شخص خوش الحانی سے یہ شعر پڑھتا ہوا جائے ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو　　شیئاً للہ از جمالِ روئے تو

دست بکشا جانبِ زنبیل ما　　آفریں بر دست و بر بازوئے تو

آخر یہ بزرگ پاگل اور بے وقوف تو نہ تھے جو بلا وجہ ایسی وصیت کر دی آخر کوئی تو بات تھی ان کو کچھ تو اطمینان تھا۔ اور مرنے کے بعد ان اشعار سے کچھ تو حظ حاصل ہونے کی توقع تھی۔ جو ایسی وصیت کی اسی طرح حضرت سلطان الاولیاء سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جنازہ کے ساتھ کسی مرید نے غلبۂ محبت میں بار بار یہ شعر پڑھا ؎

سرو سیمینا بصحرا مے روی　　سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو　　تو کجا بہر تماشا مے روی

اُس کا یہ اشعار پڑھنا تھا۔ کہ سلطان جی کی نعش کو وجد ہوا۔ اور ہاتھ کفن سے باہر اونچا ہوگیا اس پر لوگوں نے اُس مرید کو خاموش کیا۔ کہ یہ کیا غضب کرتے ہو۔ قیامت برپا ہوجائے گی۔ جنازہ کے ساتھ خاموشی سے چلو۔ غرض تھوڑی دیر میں سکون ہوا اور ہاتھ بدستور کفن کے اندر ہوگیا دیکھئے اہل محبت کو موت کے بعد بھی کیسی بےفکری حاصل ہوتی ہے۔ کہ مرنے کے بعد بھی وجد و حال باقی رہا۔ ہمارے حاجی صاحبؒ نے بھی وصیت کرنا چاہی تھی کہ میرے جنازہ کے ساتھ ذکر جہر ہوتا چلے۔ مگر مولوی اسمٰعیل صاحب نے اختلاف کیا اور کہا حضرت یہ ایک نئی بات ہے کہیں رفتہ رفتہ بدعت کا دروازہ مفتوح نہ ہوجائے۔ حضرت نے فرمایا۔ بہت اچھا جیسی رائے ہو جب جنازہ کو لے کر چلے تو سب لوگ خاموش چل رہے تھے کہ ایک عرب نے کہا مالکم ساکتین اذکروا اللہ۔ خاموش کیوں چل رہے ہو خدا کو یاد کرو۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ بے اختیار سارا مجمع ذکر جہر کرنے لگا مولوی اسمٰعیل صاحب کہنے لگے کہ میں نے تو حضرت کو اس امر کی وصیت سے روک دیا تھا۔ مگر اس کو کون روک دیتا حق تعالیٰ نے حضرت کی مراد خود پوری فرما دی۔ یہ تو مرتے ہوئے اہل محبت کی حالت تھی اب مرنے کے بعد قبر میں اُن کی حالت سنئے۔ ہمارے ہی یہاں ایک بزرگ موجود ہیں حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُن کے مزار پر ایک صاحب کشف فاتحہ پڑھنے گئے۔ جو صاحب مزار کو جانتے نہ تھے۔ جب فاتحہ پڑھ چکے تو کہنے لگے۔ بھائی یہ کون بزرگ ہیں یہ تو بڑے دل لگی باز ہیں۔ میں نے جو فاتحہ پڑھنے کا قصد کیا تو فرمایا میاں جاؤ کسی مُردہ پر پڑھو یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھنے آئے۔ لوگوں نے کہا یہ بزرگ شہید ہیں۔ کہا ہاں جبھی تو اپنے کو زندہ کہتے ہیں۔ کیونکہ شہدا قبر میں زندہ ہوتے ہیں اور اُس کے ساتھ زندہ دل بھی ہیں۔ بعضے اولیاء نے غلبۂ عشق میں فاتحہ و ایصال ثواب سے استغنا بھی ظاہر کیا ہے۔ اُن کو اس کی پروا نہیں ہوئی کہ ہمیں کوئی کچھ پڑھ کر ثواب بخشے جیسے مولانا نیاز فرماتے ہیں ؎

عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست | طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز

یہ نیاز ہو کر بھی ایسے بے نیاز بنتے ہیں (اس وقت نیاز محمد خاں حضرت کے خادم سامنے تھے وہ اپنا نام سُن کر ہنس رہے تھے۔ اور حضرت نے بھی اُن کی طرف اشارہ کر کے کچھ فرمایا جو مجھے یاد نہیں نہ نوٹ ہو سکا۔ ۱۲ جامع) اگر یہ غلبۂ حال ہے اور جن پر کمال عبدیت غالب ہے۔ وہ یوں کہتے ہیں۔ جیسے حضرت عارف شیرازی رح فرماتے ہیں ؎

اگرچہ بر ماروی دامن کشاں   از سر اخلاص الحمدے بخواں

ایک دوسرے بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جایا کرتے تھے تو ایک دن اُن کی والدہ نے قبر میں سے اُن کے ساتھ کلام کیا۔ اور کہا بیٹا۔ تم یہاں آتے ہی فوراً تلاوت قرآن نہ شروع کیا کرو۔ کیونکہ قرآن کے انوار تم کو اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ میں تمہاری صورت نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ تھوڑی دیر ٹھہر کر پھر تلاوت شروع کیا کرو۔ تاکہ میں تم کو جی بھر کر دیکھ لیا کروں۔ دیکھئے ان بزرگ کی والدہ کو وہاں برزخ میں کچھ تو اطمینان و راحت تھی جو ایسی بات کہی اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بس مردہ یوں ہی مٹی کا ڈھیر ہو کر قبر میں پڑا رہتا ہے یہ غلط ہے۔ بلکہ عالم برزخ میں مومن صالح کی روح کو دنیا سے بھی زیادہ راحت و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ ابن الفارض رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت کتابوں میں لکھی ہے کہ جب اُن کے مرنے کا وقت آیا تو آٹھوں جنتیں اُن کے سامنے کر دی گئیں تجلت لہ الجنان الثمانیۃ اُن کو دیکھ کر آپ نے منہ پھیر لیا اور کہا ؎

ان کان منزلتی فی الحب عندکم   ما قد رأیت فقد ضیعت ایامی

اگر میری محبت کی آپ کے یہاں یہی قدر ہے تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کئے۔ جو اہلِ کشف اس وقت موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ جنتیں فوراً محجوب ہو گئیں۔ اور ایک خاص تجلی ہوئی جس کے ساتھ ابن الفارض رح کی روح بھی پرواز کر گئی۔ صاحبو! اہل محبت کی موت اس طرح ہوتی ہے بےفکری و اطمینان کے ساتھ۔ پھر وہ موت سے ڈریں گے یا اُس کے مشتاق ہوں گے۔ ابن الفارض رح کے اس قصہ پر شیخ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ جنتوں کے منکشف ہونے پر اُن کا اعراض کرنا اور یہ شعر پڑھنا بتلاتا ہے کہ یہ کسی جہل میں مبتلا تھے۔ جس میں مرتے دم تک مبتلا رہے۔ نہ معلوم وصالِ حق کی حقیقت انہوں نے کیا سمجھی جو جنتوں سے اعراض کیا۔ اور اُن کے انکشاف کو تضییع اوقات کہا۔ اگر میرے دل میں شیخ ابن القیم کی عظمت نہ ہوتی تو میں اس اعتراض کا جواب نہایت سخت دیتا۔ لیکن میں اُن کو بھی عاشق سمجھتا ہوں اور زاہدانِ خشک میں سے نہیں سمجھتا۔ اس لئے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہتا کہ ابن القیم بھی عاشق ہیں اور ابن الفارض بھی عاشق ہیں۔ ہم کو دونوں کا ادب کرنا چاہئے نہ ان پر اعتراض کرنا چاہئے نہ اُن پر۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اہلِ محبت کا مقام اور حال الگ الگ ہوتا ہے

ایک عاشق دوسرے کے مقام کو بعض دفعہ نہیں سمجھتا۔ اس لئے اعتراض کر دیتا ہے میرے خیال میں شیخ ابن القیم نے ابن الفارض کے مقام کو سمجھا نہیں ہے۔ ورنہ ابن الفارض کی حالت اس سے ارفع ہے کہ وہ مرتے دم تک کسی جہل میں بتلا رہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُن کا یہ قول غلبۂ حال اور غلبۂ سکر میں بطور ادلال کے صادر ہوا ہو۔ بہر حال ہم دونوں کا ادب کرتے ہیں اور ان سے بھی یہی کہتے ہیں کہ آپ بھی باہم ایک دوسرے کا ادب کیجئے۔ اور سنئے قاضی یحییٰ ابن اکثم رحمۃ اللہ علیہ جو بخاری رحؒ کے شیوخ میں سے ہیں جب اُن کا وصال ہوگیا تو کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہئے آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ کہا مجھے حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا اور وہاں سے سوال ہوا یا شیخ السوء عملت کذا یوم کذا وعملت کذا یوم کذا۔ اے برے بڈھے بتلا تو نے فلانے دن یہ عمل کیا اور فلانے دن یہ کیا۔ جواب دے۔ میں اس سوال پر حیران ہو کر خاموش کھڑا رہا۔ تو سوال ہوا۔ ارے بڈھے بولتا کیوں نہیں۔ خاموش کیوں کھڑا ہے میں نے عرض کیا۔ الٰہی میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔ ارشاد ہوا وہ کیا۔ میں نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ معلوم ہوا تھا آج میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے ساتھ اس کے خلاف برتاؤ ہو رہا ہے ارشاد ہوا۔ تجھکو کیا معلوم ہوا ہے میں نے عرض کیا۔ حدثنا فلان عن فلان قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان سے شرماتے ہیں۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت میرے ساتھ برعکس معاملہ ہو رہا ہے۔ ارشاد ہوا کہ تمہارے راوی بھی سچے اور ہمارا رسول بھی سچا۔ جاؤ آج ہم تم کو محض بڑھاپے ہی کی بدولت بخشتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا رحمت ہے۔ اور قاضی یحییٰ بن اکثم نے بھی کیسی ہمت کی کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی حدثنا فلاں عن فلاں باقاعدہ سند کے ساتھ حدیث بیان کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ ہوّا نہیں ہے کہ وہاں جا کر ہوش و حواس گم ہو جائیں۔ بلکہ جس طرح یہاں بے تکلف باتیں کرتے ہیں ایسے ہی وہاں بھی کریں گے خصوصاً اہل محبت تو بہت ہی آزاد ہونگے۔ یہ حدیث ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم سُن کر

ےؔ روی البخاری عنہ فی غیر الجامع کما فی تہذیب التہذیب قلت یحییٰ بن اکثم ہذا من تلامذۃ الامام محمد بن الحسن الحنفی سمع ورَوٰی عنہ وعَدّہ القرشی فی الجواہر المضیۃ واللکنوی فی الفوائد البہیۃ من الحنفیۃ وقضاتہا ۱۲ ظ

ایک شخص نے ایک مسخرہ پن بھی کیا تھا۔ مگر اس سے پہلے میں اور ایک مسخرہ کی حکایت بیان کرتا ہوں مجھ سے سرائے میراں میں ایک وکیل صاحب نے بیان کیا کہ سفر حج میں ایک شخص اس وضع سے چلا کہ اس کے ہاتھ میں ایک ڈھپلی تھی۔ اُسے بجاتا اور ناچتا کودتا تھا۔ لوگوں نے کہا میاں سفر حج میں یہ حرکت۔ کہا تمہیں کیا ہم جانیں اور ہمارا اللہ۔ لوگ یہ سمجھے کہ کوئی مسخرہ ہے۔ اسی حال سے وہ مکہ تک پہنچا۔ جب مطوف کے ساتھ طواف بیت کے لئے چلے اور دروازہ حرم کے قریب پہنچے تو مطوف نے کہا دیکھو وہ ہے بیت اللہ۔ کیونکہ وہ دروازہ کے باہر ہی سے نظر آنے لگتا ہے۔ بس یہ سن کر اس شخص پر ایک حالت طاری ہوئی اور اس نے وجد کی حالت میں یہ شعر پڑھا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر　　　که مبادا بار دیگر نرسی بدیں تمنا

اور شعر پڑھتے ہی دھڑام سے گرا اور جان دیدی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ مسخرہ نہ تھا بلکہ خدا کا عاشق مجذوب تھا۔ صاحبو! اللہ کے بندے بہت سے چھپے ہوئے ہیں۔ کسی کو ظاہری حالت کی وجہ سے حقیر نہ سمجھو ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر　　　تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

بعض بعض اولیاء اللہ کو حضرت خضر علیہ السلام بھی نہیں پہچانتے غالباً تذکرۃ الاولیاء میں ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ حطیم کعبہ میں ایک دفعہ محدثین کا مجمع تھا۔ حدیث کا درس ہو رہا تھا یہ بزرگ الگ بیٹھے ہوئے تھے حضرت خضرؑ نے ان سے فرمایا کہ بھائی تم الگ کیوں بیٹھے ہو آؤ حدیث سن لو۔ فرمایا عمن یحدثون یہ کس سے حدیث بیان کر رہے ہیں۔ کہا عن سفیان الثوری وفلان یہ سفیان ثوری وغیرہ سے روایت کر رہے ہیں۔ قال فما بال من یحدث عن اللہ تعالیٰ فرمایا کہ جو شخص خود اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہو اس کو سفیان ثوری سے روایت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ سبحان اللہ کیا آپ اس مقام پر ہیں بھلا اس کی دلیل کیا ہے۔ فرمایا اس کی دلیل یہ ہے کہ میں آپ کو پہچانتا ہوں کہ تم خضر ہو اور تم مجھ کو نہیں پہچانتے۔ اسی طرح مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ نانوتہ میں ایک شخص جب مسجد میں آتے تھے ان کے آنے کے ساتھ ہی مسجد منور ہو جاتی تھی۔ حالانکہ وہ کوئی

شیخ یا عالم یا بڑے ممتاز شخص نہ تھے۔ معمولی دنیادار وضع کے آدمی تھے۔ مولانا نے اس نورانیت کا سبب دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ ایک دفعہ سید صاحب سے ملاقات و زیارت نصیب ہوئی تھی۔ ایک جلسہ کی ملاقات سے یہ کیفیت حاصل ہوگئی۔ کہ اُن کے آنے سے مسجد منور ہو جاتی تھی واقعی سید صاحب کی تو وہی کیفیت تھی۔ جو حضرت سلطان نظام الدین اولیاء نے ایک بزرگ کی نسبت بیان فرمائی ہے ؎

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد والله خلاف نیست کہ او عشق باز شد

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر تو سنگِ خارہ و مرمر شوی چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

اور کسی کا شعر ہے ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد فی الحال بصورت طلا شد

غرض دیکھئے وہ شخص ظاہر میں دنیادار معلوم ہوتا تھا۔ مگر سید صاحب کی ایک بار زیارت کرنے سے خدا تعالیٰ نے اُس کو یہ بزرگی عطا فرمائی۔ اور کسی کو پتہ نہ تھا۔ اسی طرح حضرت سلطان جی ایک بار سفر میں تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ آپ اس فکر میں تھے کہ کوئی دوسرا آدمی آجائے تو جماعت ہو جائے کہ اتنے میں سامنے سے ایک گھسیارہ گھاس کا گٹھڑ سر پر رکھے ہوئے آیا۔ سلطان جی نے اُس سے کہا بھائی نماز پڑھو گے۔ کہا ہاں اسی واسطے آیا ہوں۔ فرمایا پھر جلدی وضو کرلو۔ کہا نظام الدین مسلمان کہیں بے وضو بھی رہا کرتا ہے۔ اب جو سلطان جی نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے مقام کا شخص ہے۔ معمولی بزرگ بھی نہ تھا۔ تو ظاہری صورت سے کسی کو حقیر نہ سمجھو ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ حدیث ان اللہ یستحیی عن ذی الشیبة المسلم کو سنکر ایک شخص نے مسخرہ پن کیا کہ مرتے ہوئے ایک دوست سے وصیت کی کہ جب مجھ کو دفن کر چکو تو میرے سر اور ڈاڑھی میں تھوڑا آٹا چھڑک دینا۔ دوست نے کہا اللہ کے بندے زندگی میں تو دل لگی کیا ہی کرتا تھا۔ کیا مرتے ہوئے بھی دل لگی کرتا ہے۔ بھلا اس حرکت سے کیا نفع۔ کہا تم کو کیا

اگر تم کو ہماری دوستی کا پاس ہے تو ہماری وصیت کو پورا کر دینا۔ خیر وہ ہنسکر اس پر راضی ہوگیا۔ اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ بڑا ہی دل لگی باز ہے کہ مرتے مرتے بھی ظرافت سے باز نہ آیا۔ چنانچہ دفن کے بعد اس نے وصیت پر عمل کیا۔ پھر ایک دن اُسے خواب میں دیکھا پوچھا کہو کیا حال ہے۔ کہنے لگا کہ مجھے حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں سے سوال ہوا کہ آپ نے یہ وصیت کیوں کی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ الٰہی میں نے سنا تھا کہ آپ بوڑھے مسلمان سے شرماتے ہیں۔ سو بوڑھا ہونا تو میرے اختیار میں نہ تھا۔ کیونکہ بوڑھاپے سے پہلے آپ نے بلا لیا۔ تو میں نے چاہا کہ بوڑھوں کی سی صورت ہی بنالوں۔ اس لئے آٹا ملنے کی وصیت کی تھی۔ ارشاد ہوا جاؤ تمہیں بخشدیا گیا۔ یہ تو برزخ کے واقعات تھے۔ اور قیامت میں یہ حالت ہوگی ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ۝ فرشتے قبروں سے نکلتے ہی بشارت دیں گے کہ دنیا کے فوت کا رنج نہ کرو اور آئندہ کسی مصیبت کا خوف نہ کرو اور جنت کی بشارت حاصل کرو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ اور ہر چند کہ قیامت کا دن بہت ہولناک اور سخت ہے۔ مگر مسلمان کے لئے خصوص اہل محبت کے لئے وہ نہایت آسان ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے مگر مومن کے لئے ایسا معلوم ہوگا جیسا نماز کا وقت اور عشاق کے لئے تو قیامت کا دن تماشا گاہ ہے میں نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے ایک شعر سنا تھا اس وقت وہ یاد آتا ہے ؎

عاشقاں را روز محشر باقیامت کار نیست
عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

شاید یہاں کسی کو یہ خیال ہو کہ مسلمانوں میں بعضے گنہگار بھی ہیں۔ اور اہل محبت تو اپنے کو سب سے زیادہ گنہگار سمجھتے ہیں۔ تو قیامت میں گناہوں پر سزا بھی تو ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ واللہ مجھے تو یقین ہے کہ مسلمانوں کو بہت کم سزا ہوگی حضرت حق ان کو تو کسی بہانہ سے معاف ہی کر دیتے ہیں۔ (سبحان اللہ کیسی رجاء اور کیسی محبت ٹپکتی ہے) میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ سمجھکر تم حق تعالیٰ سے ڈرو ہی نہیں۔ ڈرو ضرور دل میں ہیبت رکھو۔ مگر ایسی ہی ہیبت رکھو جیسی محبوب سے ہوا کرتی ہے۔ محبوب سے اس کے جمال و جلال کی وجہ سے ہیبت ہوتی ہے۔ ہوا

سمجھ کر وحشت اور خوف نہیں ہوتا اس ہیبت کو ایک شاعر نے خوب بیان کیا ہے ؎

سامنے سے جب وہ شوخ دل رُبا آجائے ہے — تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

خلاصہ یہ کہ محبوب سے ہیبت تو ہوتی ہے۔ مگر وحشت نہیں ہوتی۔ اسی طرح حق تعالیٰ سے اور اُن کی تقارے سے وحشت نہ ہونی چاہیے اور اس کا طریقہ یہ ہو کہ محبت پیدا کرو محبت کے بعد تم گنہگار ہو کر بھی حق تعالیٰ سے متوحش اور موت سے متنفر نہ ہو گے اور محبت کا وہی طریقہ ہے جو اوپر بتلایا ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کو اور اُن کے احسانات کو یاد کرو۔ دوسری بات یہ کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو اور تیسری بات اور بھی ہے کہ تھوڑی دیر ذکر کر لیا کرو۔ گو خلوص سے نہ ہو مگر خلوص کے لئے بھی نہ ہو یعنی دنیا کے لئے نہ ہو جیسے آجکل لوگ گیارہویں کرتے ہیں جس میں عموماً محض دنیا کی نیت ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے سال بھر تک برکت و عافیت رہے گی اور نہ کریں گے تو وبال آئیگا۔ میں نے ایک شخص سے کہا تھا کہ تم لوگ ہم کو تو وہابی کہتے ہو اور یوں بدنام کرتے ہو کہ انکو بزرگوں کا ادب نہیں اور خود تمہارے ادب کی یہ حالت ہے کہ دنیوی معاملات کے واسطے گیارہویں کرتے ہو کہ بڑے پیر صاحب ہمارے کھیت کی نگہبانی کریں گے یا دُکان کی حفاظت کریں گے۔ کیا بزرگوں کا یہی ادب ہے۔ اس کا اُن کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ غرض ذکر میں اس قسم کی نیت تو نہو۔ اس کے بعد چاہے خلوص ہو یا کم از کم خلوئے ذہن ہی ہو پھر اس میں خواہ قلب کو سکون ہو یا کہ وساوس بھی آتے ہوں۔ اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ ذکر گو خلوص سے نہ ہو اور گو وساوس ہی کے ساتھ ہو اثر سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ذکر غیر خالص کا اثر یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ خلوص پیدا ہو جاتا ہے اور ذکر مع الوساوس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ چند روز کے بعد وساوس اسی ذکر سے دفع ہو جاتے ہیں۔ اب یہاں سے میں جواب دیتا ہوں۔ ایک شعر کا جو مثنوی کا نہیں ہے بلکہ نان وحلوا کا ہے جس کا مصنف شیعی ہے بہاء الدین عاملی۔ مگر واعظوں نے اس شعر کو مثنوی کی طرف منسوب کر کے عوام کا ناس کر دیا۔ وہ عام طور پر اپنے مواعظ میں اس پر زور دیتے ہیں کہ آجکل کے لوگوں کا نماز روزہ کچھ نہیں ہے محض بیکار ہے۔ کیونکہ نماز کی حالت میں وسوسے اُن کو گھیرے رہتے ہیں۔ ذکر میں خیال منتشر ہوتا ہے۔ اس پر یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر — ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

مگر میں تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں۔ ع

این چنین تسبیح ہم دارد اثر

اور واللہ اگر مجھے اور بہاء الدین کو ایک جگہ جمع کر کے قسم دی جاتی کہ جو کچھ تم کہتے ہو اگر صحیح ہو تو قسم کھالو۔ میں تو قسم کھا لیتا۔ اور وہ انشاء اللہ ہرگز قسم نہ کھا سکتے۔ بہر حال اس کا انتظار نہ کرو۔ کہ یکسوئی و اطمینان نصیب ہو تو ذکر اللہ میں مشغول ہوں۔ بہت لوگوں کی عمریں اسی میں ختم ہوگئیں۔ کہ پنشن مل جائے تو دینداری اختیار کریں اور گورنمنٹ کی پنشن سے پہلے اُن کو دنیا ہی سے پنشن مل گئی۔ اور آخرت میں جا پہنچے۔ صاحبو! حق تعالیٰ کی طرف سے تو ہر وقت آپ کو یہ ندا ہے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

یعنی تم جیسے بھی ہو اسی حالت میں متوجہ ہو جاؤ چاہے کیسے ہی گوہ در گو ہو کیونکہ دور رہ کر تم پاک ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ناپاک ہو اور دریا میں اس لئے نہ جاتا ہو کہ وہ پاک شفاف اور میں ناپاک اس حالت میں کیونکر جاؤں۔ بلکہ پاک ہو کر جاؤں گا۔ تو دریا اس سے یہی کہے گا کہ تو جیسا بھی ہے اسی حال میں میرے پاس چلا آ کیونکہ مجھ سے دور رہ کر تو پاک نہیں ہو سکتا۔ پس اس کا ہرگز خیال نہ کرو کہ ہم تو گنہگار ہیں۔ دنیا دار ہیں۔ دنیا کے علائق میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس حال میں کیونکر ذکر اللہ شروع کریں۔ صاحبو! تم اسی حال سے کام شروع کر دو پھر تمہارے علائق اور گناہوں کو یہی کم کر دے گا اسی طرح اس سے بھی پریشان نہ ہونا چاہئے۔ کہ پابندی نہیں ہوتی۔ ناغہ ہو جاتا ہے۔ میرے ایک دوست کا خط مثنوی کے وزن میں منظوم آیا تھا جس میں اسی کی شکایت تھی کہ پابندی نہیں ہوتی۔ ناغہ ہو جاتا ہے۔ اس سے پریشان ہوں۔ جی چاہا کہ جواب بھی منظوم ہو۔ مگر اتنی کسے فرصت کہ نظم تصنیف کرے دوسرے مجھے تکلفات سے وحشت بھی ہوتی ہے۔ نیز مجھے نظم میں ملکہ بھی نہیں ہے لیکن دل چاہتا تھا۔ کہ جواب بھی نظم میں ہو۔ حق تعالیٰ نے مثنوی کا ایک شعر یاد دلا دیا جس میں سارے خط کا جواب تھا۔ میں نے وہی لکھ دیا وہ شعر یہ ہے ؎

دوست دارد دوست این آشفتگی کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی

سبحان اللہ کیا عمدہ دلیل بیان کی ہے کہ ایسی بے انتظامی کی سعی سونے سے اور کچھ نہ کرنے سے تو بہتر ہی ہے تو اس کو بھی فضول نہ سمجھو یہ بھی مفید ہے۔ ہمارے مولانا کا ارشاد ہے کہ دوام کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسی حالت پر دوام ہو جائے۔ کہ کبھی کام کر لیا اور کبھی ناغہ ہو گیا تو تم لشتم پشتم ہی کام کئے جاؤ انشاء اللہ ایک دن تم پر ضرور رحم ہو گا۔ اور تم پر کیوں نہ رحم کریں گے جب کہ وہ اپنے دشمنوں پر بھی ایسے مہربان ہیں کہ ایک بُت پرست صنم صنم کا ورد کر رہا تھا۔ ایک دن بھولے سے صمد منہ سے نکل گیا۔ فوراً آواز آئی۔ لبیک یا عبدی لبیک۔ یہ آواز سنکر بُت پرست پر حال طاری ہو گیا۔ اور اس نے بُت کو زور سے ایک لات ماری کہ کمبخت سالہا سال سے میں تجھ کو پکار رہا ہوں تیرے پھوٹے منہ سے کبھی ایک حرف بھی نہ نکلا۔ قربان جاؤں اپنے پروردگار کے کہ ایک بار بھولے سے اس کا نام زبان پر آگیا۔ تو فوراً سن لیا۔ اور جواب دیا۔ اس کے بعد وہ اسلام لے آیا تو حق تعالیٰ تو ایسے مہربان ہیں وہ آپ پر کیسے رحم نہ کریں گے۔ حالانکہ آپ تو خدا کی خاص جماعت میں داخل ہیں ؎

دوستاں را کجا کنی محروم　　　تو کہ با دشمنان نظر داری

اور سنیے حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے۔ جو غالباً شیخ عبدالحق دہلوی نے کسی رسالے میں لکھا ہے کہ ایک بار آپ رات کو اٹھے اور خانقاہ کے دروازہ کی طرف چلے۔ خادم نے دیکھا کہ حضرت خانقاہ کے دروازہ کی طرف جا رہے ہیں تو وہ بھی ساتھ ساتھ ہو لیا۔ مگر اس طرح کہ حضرت کو خبر نہ ہو۔ یہ ادب ہے مشائخ کا کہ ان کے خاص اوقات میں مثلاً تہجد کے وقت ان کے پاس جا کر نہ بیٹھے۔ نہ سامنے جا کر کھڑا ہو بلکہ دور رہ کر دیکھتا رہے اگر ان کو کسی کام کی ضرورت قرینہ سے معلوم ہو تو وہ کام کر دے ورنہ الگ رہے۔ اور ان کے اوقات میں خلل نہ ڈالے کیونکہ بزرگوں کو تہجد یا خلوت کے وقت کسی کا پاس ہونا گوارا نہیں ہوتا۔ اور مجھے بھی گو میں کچھ نہیں ہوں صبح کی نماز کے بعد باتیں کرنے والے پر غصہ آتا ہے۔ کہ یہ کیسا بے قدر ہے کہ ایسا نورانی وقت ضائع کرتا ہے صبح کی نماز کے بعد سے طلوع شمس تک یہ وقت ذکر اللہ کیلئے عجیب ہے۔ اس کو

ؒ یہ وہ دوام مطلوب تو نہیں ہے مگر اس کا مقدمہ ہو کر اسی کے حکم میں ہو جاتا ہے جیسا حدیث میں انتظار صلوٰۃ کو صلوٰۃ فرمایا گیا ہے نفس کو ہمت دلانے کیلئے یہ عنوان اختیار کیا گیا اس کو حکما و تربیت سمجھتے ہیں۔ ۱۲ منہ

ضائع نہ کرنا چاہئے۔ غرض حضرت غوث اعظم خانقاہ سے باہر تشریف لے چلے اور خادم ساتھ ساتھ رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ حضرت کو اطلاع نہ ہو۔ یہاں تک دروازہ شہر پناہ پر پہنچے جو مقفل تھا مگر حضرت کی برکت سے قفل کھل گیا۔ اور دونوں صاحب یکے بعد دیگرے شہر سے باہر نکلے۔ تھوڑی دیر میں ایک نیا شہر نظر پڑا۔ خادم کو بڑی حیرت ہوئی کہ بغداد کے متصل تو کوئی بھی شہر نہیں یہ کہاں سے آگیا۔ مگر وہ اصل میں متصل نہ تھا۔ بہت دور تھا۔ حق تعالیٰ نے غوث اعظم کی کرامت کیلئے زمین کی طنابیں کھینچ دیں۔ اس سے وہ قریب ہو گیا۔ چنانچہ دونوں صاحب ایک مکان میں پہنچے جہاں اولیاء اللہ کا ایک مجمع تھا۔ اور اس مکان کے ایک سمت میں ایک درجہ تھا۔ جہاں سے کسی بیمار کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر وہ آواز منقطع ہو گئی۔ اور پانی کے گرانے کی آواز آنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے ایک جنازہ برآمد ہوا۔ اور چند آدمی ساتھ تھے۔ جن میں ایک بوڑھے بزرگ گویا اس مجمع کے سردار معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے کہا جنازہ تیار ہے۔ سب حضرات نے جنازہ کی نماز پڑھی۔ حضرت غوث اعظم امام بنے۔ نماز کے بعد جنازہ کو لے گئے۔ اور جو پہلے سے حضرت کے پاس جمع تھے وہ بدستور حاضر رہے اور انہوں نے حضرت غوث اعظم سے کچھ عرض کیا۔ اور تھوڑی دیر میں ایک شخص عیسائی حاضر ہوا۔ آپ نے اس کا زنار توڑ کر الگ کیا۔ اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی اس کو تلقین کی۔ مسلمان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ شخص اس کے قائم مقام ہے۔ اس کے بعد آپ ہاں سے رخصت ہوئے اور تھوڑی دیر میں بغداد میں داخل ہو گئے۔ خادم بھی الگ الگ ساتھ رہا۔ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو اس وقت کسی کتاب کا درس ہوا کرتا تھا۔ آپ نے خادم سے فرمایا کہ آؤ سبق پڑھ لو۔ وہ کتاب لے کر حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا۔ حضرت رات کے واقعہ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لئے طبیعت کو بہت تشویش ہے۔ پڑھنے کو بھی دل حاضر نہیں۔ پہلے اس کی حقیقت بتلا دیجئے۔ تب کچھ پڑھوں۔ فرمایا کیا تم رات ہمارے ساتھ تھے۔ کہا ہاں۔ فرمایا یہ مجمع ابدال کا تھا اور وہ شہر موصل تھا۔ ان میں سے ایک شخص قریب مرگ تھے۔ حق تعالیٰ نے مجھے مطلع فرمایا۔ میں گیا۔ وہ جنازہ ان ہی بزرگ کا تھا۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ بوڑھے حضرت خضر تھے جو ان کے جنازہ کے مامور تھے اور چونکہ ابدال کا محکمہ میرے تحت میں ہے اس لئے مجھ سے پوچھا گیا کہ اس کا قائم مقام اب کون ہو گا۔ میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی وہاں سے الہام ہوا کہ قسطنطنیہ کے فلاں

عیسائی کو دیدی جائے۔ چنانچہ وہ خرقِ عادت کے طور پر حاضر ہوا میں نے اُس کو مسلمان کیا اور مسلمان ہوتے ہی وہ مقام ابدال پر پہنچ گیا۔ نہ معلوم حق تعالیٰ کو اُس شخص کا کونسا عمل پسند آگیا ہوگا۔ جو اُس کو اسلام کی توفیق دی۔ اور بہت جلد اس مقام عالی پر پہنچ گیا۔ کیونکہ بعضے کافر بھی اپنے زعم میں اعمال حسنہ کرتے ہیں۔ جیسے صلہ رحم، ہمدردی، اعانتِ مظلوم وغیرہ۔ ان اعمال پر کفر کی حالت میں تو کچھ ثواب نہیں ملتا۔ مگر حق تعالیٰ بعضوں کو ان اعمال کی برکت سے اسلام کی توفیق دیدیتے ہیں جس سے گذشتہ اعمال حسنہ پر بھی ثواب ملتا ہے۔ اور آئندہ اعمال پر تو ثواب ملے ہی گا۔ اسلمت علی ما اسلفت من خیر حدیث ہے تو پھر آپ کیوں مایوس ہوتے ہیں۔ کیا آپ سے مسلمان ہوکر بھی ساری عمر میں ان دونوں کافروں کے برابر کوئی عمل نہ ہوا ہوگا جس سے آپ نظرِ عنایت کے مستحق ہو جائیں۔ ان دونوں حکایتوں سے دو باتیں حاصل ہوئیں ایک تو یہ کہ انسان کو تکبر و عجب نہ کرنا چاہیے۔ نہ کسی کو حقیر سمجھنا چاہیے۔ کیا خبر ہے حق تعالیٰ نے کس کے واسطے کیا مقدر کر رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ معصیت سے مایوس نہ ہو اور دل شکستہ نہ کرے حق تعالیٰ بڑے رحیم و کریم ہیں۔ وہ تو کافروں پر بھی اگر وہ ذرا سی توجہ کریں بہت جلد رحم فرماتے ہیں پھر مسلمان پر کیوں نہ رحم فرمائیں گے بس تم خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا کرلو جس کے طریقہ کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ اُن کے انعامات و احسانات کو یاد کرو مراقبہ الآء اللہ میں مشغول ہو جاؤ۔ واللہ مصیبت کے اندر بھی تم کو نعمتیں نظر آئیں گی۔ نیز ذکر اللہ کے لئے ایک وقت خاص کرلو پھر چند روز میں انشاء اللہ چند ہی روز میں جس کی مقدار میں خود مقرر نہیں کرتا۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مقدار خود ارشاد فرمائی ہے۔ من اخلص للہ اربعین یومًا ظہرت ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ (رواہ ابو نعیم فی الحلیۃ عن ابی ایوب کذا قال العراقی) اور عارف شیرازی اسی ہدایت کی خاصیت فرماتے ہیں ؎

شنیدم رہروے در سرزمینے — ہمی گفت این معما با قرینے

کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف — کہ در شیشہ بماند اربعینے

یعنی چالیس روز میں انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا ہو جائیگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ چالیس دن میں تم جنید بغدادی ہو جاؤ گے۔ مگر عاشق اور محب ضرور ہو جاؤ گے

اگر تم کو اس بات پر دل سے اعتقاد نہیں ہوتا تو تم آزمائش ہی کے طور پر کر کے دیکھ لو انشاء اللہ بہت جلد راستہ کھلے گا۔ اور گو آزمائش کے لئے عمل کرنا خلوص سے نہ ہو گا۔ مگر میں مولانا کے تجربہ کے اعتماد پر کہتا ہوں کہ آپ آزمائش ہی کے لئے عمل کر کے دیکھ لیجئے انشاء اللہ تعالیٰ اثر ظاہر ہو گا اور راستہ کھلتا ہوا نظر آئے گا جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　آزمودن یک زمانے خاک باش
در بہاراں کے شود سرسبز سنگ　　خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

یہ شبہ نہ کرو کہ راستہ کیسے کھلے گا۔ ہمارے درمیان میں تو گناہوں کے حجابات بہت ہیں میں کہتا ہوں کہ آپ چلنا تو شروع کریں۔ سب حجابات خود بخود اٹھتے چلے جائیں گے۔ میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ یہاں سے دہلی جانا چاہیں۔ تو دہلی تک راستہ کھلا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ بظاہر دیکھنے میں دور سے سڑک کے دو طرفہ درختوں کے ملے ہوئے نظر آنے سے راستہ بند معلوم ہوتا ہے۔ پھر آسمان چونکہ کروی ہے وہ بھی حد نظر پر زمین سے ملا ہوا نظر آتا ہے اور راستہ طے کرنے سے مانع معلوم ہوتا ہے۔ اس حالت میں آپ نے رفیق سے کہا کہ دہلی چلو وہ کہتا ہے کہ راستہ تو سامنے سے بند نظر آتا ہے۔ کیونکر چلیں۔ آپ اُس سے کہتے ہیں کہ نہیں تم چلو تو سہی راستہ تو کھلا ہوا ہے۔ مگر اس انفتاح کا علم سیر ہی سے ہو گا۔ بدوں سیر کے نہ ہو گا۔ اب اگر رفیق نے آپ پر اعتماد کیا اور چلنا شروع کیا تو وہ دعا دیگا۔ کہ واقعی جوں جوں چلتے ہیں راستہ نکلتا ہی چلا آتا ہے۔ اور اگر اُس نے اعتماد نہ کیا تو جب آپ کے دہلی پہنچ جانے کی اُسے اطلاع ہو گی۔ اس وقت وہ افسوس کرے گا۔ مولانا رومی بڑی قوت سے اسی کے متعلق فرماتے ہیں اور واقعی محقق کے کلام میں ایک قوت ہوتی ہے۔ شاعروں کے کلام میں وہ قوت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد ہے ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

یہ ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے جو سیر میں منقول ہے گو حجت تو نہیں ہے مگر تائید و تمثیل کیلئے کافی ہے۔ منقول ہے کہ زلیخا نے جس وقت یوسف علیہ السلام کو اپنے دام میں پھنسانا چاہا ہے تو اُس نے آپ کو ایسے مکان میں بلایا جس کے یکے بعد دیگرے سات دروازے تھے۔ اور

ہر دروازہ پر قفل ڈالدیا تھا تاکہ یوسف بھاگ نہ جائیں۔ پھر جب اس نے یوسف علیہ السلام سے اظہار مدعا کیا۔ اور آپ نے اس سے صاف انکار کیا تو آپ کو فکر ہوئی کہ اس عورت کے پنجہ سے کس طرح نکلوں۔ اس نے تو بری طرح مجھے مقید کیا ہے۔ بس معاً آپ کو یہ خیال ہوا کہ جتنا میری قدرت میں ہے مجھ کو تو وہ کرنا چاہیئے۔ آگے جو کام خدا تعالیٰ کی قدرت کا ہے وہ خود کردیں گے چنانچہ آپ نے وہاں سے بھاگنا شروع کیا۔ اب رحمت حق کو دیکھئے کہ جس دروازہ پر آپ پہنچے۔ وہ باذن اللہ خود بخود کھل جاتا۔ اور قفل ٹوٹ کر گر پڑتا۔ اسی طرح ہر دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وارمی باید دوید

یعنی اگرچہ عالم میں کوئی راستہ کھلا ہوا نظر نہیں آتا۔ مگر ہم کو یوسف علیہ السلام کی طرح طالب بنکر دوڑنا تو چاہیئے۔ انشاء اللہ خود بخود راستہ نظر آئے گا۔ صاحبو! اس واقعہ سے ہم کو سبق لینا چاہیئے ہماری حالت تو یہ ہے کہ جہاں آڑ بھی نہیں وہاں کھڑے کھڑے پاؤں ملتے ہیں اور خواہ مخواہ اپنے سامنے ایک آڑ سمجھتے ہیں۔ اور ان کی یہ حالت ہو کہ جہاں واقعی آڑ تھی وہاں بھی مایوس نہیں ہوئے ہماری شیطان نے راہ مار رکھی ہے۔ ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فھل انتم منتھون ط یہ تم کو مایوس کر رہا ہے۔ اور خواہ مخواہ تمہارے سامنے ایک آڑ بنا کر کھڑی کر دیتا ہے۔ اور یہ اس کمبخت کی ہمت ہے کہ جس کام کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء تشریف لائے (کما ورد فی بعض الروایات وان کان الصحیح عدم تعیین عددھم ولکنہ ذکرہ تمثیلاً) یہ کمبخت اکیلا سب کے مقابلہ کے لئے تیار ہے اور انبیاء کے کام میں روڑے اٹکاتا ہے اور گو انبیاء و عارفین ہمیشہ اس کی تدابیر کو توڑ پھوڑ کر پھینکدیتے ہیں مگر یہ پھر بھی ہمت نہیں ہارتا اس کی تو ہمت دیکھئے۔ اور ایک آپ ہیں کہ شیطان سے ڈر گئے اور اس کے دھوکے میں آگئے۔ شاید تم یہ کہو کہ اس کی تو بڑی قوت ہے کہ انسان کے اندر اس طرح چلتا ہے جس طرح خون چلتا ہے میں کہتا ہوں چلنا تو صحیح مگر قوت بالکل غلط اس میں خاک بھی قوت نہیں حق تعالیٰ صاف فرماتے ہیں۔ ان کید الشیطان کان ضعیفاً کہ شیطان کی چالیں بہت کمزور ہوتی ہیں اور فرماتے ہیں۔ انہ لیس لہ سلطان علی الذین اٰمنوا وعلیٰ ربھم یتوکلون ط

کہ مسلمانوں پر اس کا کچھ بھی اختیار نہیں۔ جو اپنے خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کی زیارت کو کوئی شخص گئے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کے قریب جا کر دیکھا کہ وہ تلاوت قرآن کے لئے بیٹھے تو یہ باہر ہی رک گئے۔ مگر قریب سے سنا کہ اول اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہا پھر فرمایا ارے شیطان خوش مت ہونا کہ میں تجھے اتنا بڑا سمجھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی پناہ تجھ سے بچنے کے لئے طلب کرتا ہوں۔ یاد رکھ میں تجھے کچھ نہیں سمجھتا۔ رہا اعوذ باللہ پڑھنا سو یہ محض اپنے محبوب کے حکم کی تعمیل کے لئے ہے۔ واقعی عارف شیطان کو کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کی چالوں کو دم بھر میں توڑ کر رکھدیتا ہے۔ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دفعہ وضو سے فارغ ہو کر مسجد میں جا کر مصلے پر پہنچکر یہ شبہ ہوا کہ شاید میں نے خفین کا مسح نہیں کیا۔ اس لئے وضو کی جگہ لوٹ کر مسح کر لیا۔ بس اب شیطان نے پیچھا لیا۔ اس کے بعد کبھی مصلے پر پہنچکر کبھی اس کے قبل یہی شبہ ہوتا کہ مسح نہیں کیا۔ کچھ دنوں تو احتیاط پر عمل کر کے دوبارہ مسح کر لیا پھر سمجھ گئے کہ یہ تو شیطان کا وسوسہ ہے۔ ایک بار جو مصلے پر پہنچکر یہی شبہ ہوا تو آپ نے اس کی پروانہ کی اور ہمت کر کے نماز شروع کر دی۔ اب شیطان نے کہنا شروع کیا کہ بدون مسح کے وضو صحیح نہیں۔ اور بدون وضو کے نماز صحیح نہیں یہ نماز اکارت جائیگی آپ نے فرمایا تیری بلا سے تو ایسا ہی تو میری نماز کا خیر خواہ ہے۔ شیطان نے کہا کہ عمداً بدون وضو کے نماز پڑھنا کفر ہے۔ فرمایا تیری بلا سے۔ تجھے اگر ایمان سے خیر خواہی ہوتی تو مخلوق کو کافر کیوں بناتا۔ تو جو چاہے کہہ یہ نماز تو میں بدون مسح ہی کے پڑھوں گا (یہ مجارات خصم کے طور تھا۔ ورنہ ایسا شبہ شرعاً خود معتبر نہیں) مولانا فرماتے تھے کہ اس نماز کے بعد پھر شیطان نے کبھی وضو میں وسوسہ نہیں ڈالا۔ دیکھا آپ نے کہ عارفین اس کی تدبیروں کو کس طرح باطل کرتے ہیں اسی واسطے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد۔ پس شیطان سے ڈر دست۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ کسی محقق کے ساتھ تعلق پیدا کرو تاکہ وہ تم کو شیطان کی تدابیر کا توڑ بتلاتا رہے۔ کیونکہ یہ راستہ بہت نازک ہے اور اس میں وساوس وخطرات بھی بہت نازک پیش آتے ہیں بعض دفعہ شیطان اس طرح وسوسہ ڈالتا ہے کہ اس کو محقق عارف کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ نیز اس راستہ کے علوم واحوال

ومقامات بھی بہت نازک ہیں۔ چنانچہ اس تقریر میں آپ نے بہت سے نازک علوم سے ہونگے
اس لئے بدوں محقق کے اتباع کے چارہ نہیں اور جو لوگ خود تنہا بدوں تعلق کسی محقق کے اس راہ میں کامیاب
ہو گئے ہیں۔ ان کے واقعات سے شبہ نہ کیجئے۔ مولانا اس کے جواب میں فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر این رہ را برید　　　　ہم بعون ہمت مردان رسید

اس میں مولانا نے اس شبہ کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایسا نادر ہوا ہے والنادر کالمعدوم
امور نادرہ کی وجہ سے قواعد پر نقض وارد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ گو ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ
وہ تنہا پہنچے مگر درحقیقت وہ بھی کسی کامل کی ہمت ہی سے پہنچے ہیں۔ کیونکہ بعض اہل اللہ سب مسلمانوں
کے واسطے دعا کرتے ہیں۔ اور ان کی دعا سے بہت لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو خبر
بھی نہیں ہوتی کہ ہم کس کی دعا سے کامیاب ہوئے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ بعض اہل اللہ
کے مرنے پر غیر مریدوں کو بھی اپنے قلب میں تغیر معلوم ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ منکر و معاند نہ ہوں
کیوں کہ اب تک اس شخص کی غائبانہ دعا و توجہ سے فیض ہو رہا تھا۔ جو اس کی موت سے بند
ہو گئی۔ اس لئے مریدین کے علاوہ دوسروں کو بھی اپنی حالت میں وہ تغیر محسوس ہوتا ہے۔
جس کے باب میں حدیث شریف میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ارشاد وارد ہے ما نفضنا
الایدی عن دفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی انکرنا قلوبنا۔ وہاں تو وجہ ظاہر تھی
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب مسلمانوں سے تعلق تھا۔ مگر آپ کے خلفاء میں بھی بعض ایسے ہوتے
ہیں جن کو اتباع سنت نبویہ کی وجہ سے عام طور پر سب مسلمانوں سے تعلق ہوتا ہے جس کا
احساس اُن کے مرنے پر سب کو ہوتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذکر خواہ خلوص سے ہو یا وساوس
کے ساتھ بہر حال نافع ہوتا ہے۔ پس تم اس پر عمل کرو۔ اور اپنے اندر محبت پیدا کرو۔ اور آلاء اللہ
کو یاد کرو۔ تو تم بہت جلد عشاق میں داخل ہو جاؤ گے۔ وان کنتم عصاۃ عتاۃ اس عشق سے
یہ اثر بھی ہو جائیگا کہ موت کو حیات پر ترجیح ہو گی۔ اور یہ ترجیح عقلی تو ضرور ہو گی۔ اور چونکہ یہ شخص
مجذوب نہیں ہے اس لئے طبعی کراہت کا بھی کچھ اثر باقی رہے گا۔ مگر وہ اثر مضر نہ ہو گا۔ اور
اس اثر سے قلب میں وحشت پیدا نہ ہو گی۔ کیونکہ اس کے ساتھ موت کی محبت عقلی بھی جمع
ہے۔ بلکہ اس کراہت سے ایک نفع ہو گا۔ وہ یہ کہ اس شخص کو مجاہدہ کا ثواب ملیگا۔ کہ طبعاً تو

موت ناگوار ہے۔ مگر محبت عقلی کی وجہ سے یہ اپنے کو موت کے لئے مہیا اور تیار کر رہا ہے۔ اور اگر یہ شخص مجذوب ہوا تو اس کو موت سے طبعی کراہت بھی نہ ہوگی۔ یہ ترتیب ہوگی تاثیر عشق میں اب میں ختم کے قریب آگیا ہوں۔ اور اگلی آیت کا ترجمہ کرتا ہوں۔ کیونکہ اُس کو بھی مناسبت ہے اس مضمون سے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وقاتلوا فی سبیل اللہ واعلموا ان اللہ سمیعٌ علیمٌ کہ اللہ کے راستہ میں قتال کرو۔ اس کو اس مضمون سے یہ مناسبت ہے کہ طاعون میں بھی شانِ قتال ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شانِ قتل ہے کیونکہ قتال طرفین سے ہوتا ہے اور یہاں صرف ایک طرف سے ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ الطاعون من وخز اعدائکم الجن مگر قتال میں مدافعت بالمثل ممکن ہے۔ اور اس کی اجازت بھی ہے بلکہ امر ہے اور یہاں اس مدافعت کی کوئی صورت نہیں کیونکہ وخز اور واخز کا ہم کو ادراک ہی نہیں ہوتا۔ ہاں مدافعت بالعلاج کی اجازت ہے۔ کہ دوا دارو کرو طبی تدابیر کا استعمال کرو۔ یہ تو مشابہت حقیقت میں ہے۔ دوسری مشابہت طاعون کو قتال سے کہ فرع ہے پہلی مشابہت کی وہ مشابہت حکم میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح فرار من الزحف حرام ہے۔ اسی طرح طاعون سے بھاگنا بھی حرام ہے اور حدیث شریف میں فرار من الطاعون کو فرار من الزحف کے مثل قرار دیا گیا ہے اور یہ تو فرار میں قبح نقلی ہے۔ پھر طاعون سے بھاگنا عقلاً بھی قبیح ہے۔ کیونکہ مفید تو ہے نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بھاگنے والوں کی موت بھی طاعون ہی میں ہوتی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس میں ذلت بھی ہے۔ جہاں یہ لوگ جاتے ہیں۔ وہاں کے باشندے اُن سے پرہیز بلکہ نفرت و وحشت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان سے دور رہو یہ طاعون کی جگہ سے آئے ہیں۔ اور مان بھی لو کہ بھاگنا مفید ہے۔ لیکن اخیر بات یہ ہے کہ جان حق تعالیٰ کی ہے جہاں جس طرح حکم ہو ہم کو اس کی تعمیل ضروری ہے۔ کہیں حق تعالیٰ نے احتیاط کی اجازت دی ہے۔ اور یہاں یہی حکم ہے کہ اس طریقہ سے احتیاط نہ کرو۔ جیسے فوج میں تم خود کہتے ہو کہ بھاگنا قانوناً جرم ہے۔ حالانکہ وہ بھی احتیاط ہی ہے۔ یہ اہل فلسفہ کا منہ بند کرنے کے لئے جواب ہے کہ وہ اس حکم عدم فرار پر عقلی اعتراض کیا کرتے ہیں۔ البتہ چونکہ مسئلہ فرعی ہے اعتقادی اور اصولی نہیں اس لئے اس میں محل فرار کی تعیین میں اجتہاد سے اختلاف کی گنجائش ہوگئی ہے

اکثر علماء اس حکم کو علت خاصہ کے ساتھ معلل کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ فرار فی نفسہ حرام نہیں بلکہ خلل فی الاعتقاد کی وجہ سے حرام ہے یعنی جس کا یہ اعتقاد ہو کہ یہاں سے بھاگ کر طاعون سے بچ جاؤنگا۔ اور عدم فرار سے ہلاک ہو جاؤنگا۔ اس کو بھاگنا جائز نہیں اور جس کا یہ اعتقاد نہ ہو اُس کو چلا جانا جائز ہے۔ مگر اول تو حدیث شریف میں جو اس فرار کو فرار من الزحف سے تشبیہ دی گئی ہے وہ اس تعلیل سے آبی ہے۔ ورنہ لازم آتا ہے کہ فرار من الزحف میں بھی یہی تفصیل ہو۔ دوسرے یہ کہ اس اعتقاد سے تو ہر مرض اور ہر بلا سے فرار حرام ہے۔ طاعون ہی کی کیا تخصیص ہے۔ حالانکہ حدیث سے صریح تخصیص مفہوم ہوتی ہے تیسرے یہ کہ جس کا اعتقاد درست ہوگا۔ وہ بھاگے گا ہی کیوں۔ بھاگے گا تو وہی جس کا اعتقاد کمزور ہوگا۔ تو تفصیل بھی بے معنی ٹھہرتی ہے۔ اور بعض نے اس ممانعت کی علت یہ بتلائی ہے کہ بھاگنے کی صورت میں پیچھے رہنے والوں کو تکلیف ہوگی۔ اس علت کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ اگر سب کے سب بھاگ جائیں تو جائز ہے اور انفراداً بھاگنا حرام ہے۔ اور ان لوگوں نے ایک واقعہ سے استدلال کیا ہے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لشکر ایک مقام میں فروکش تھا وہاں طاعون شروع ہو گیا۔ اور حضرت عمرؓ نے لشکر کو وہاں سے منتقل ہونے کا امر فرمایا۔ مگر یہ علت بھی اُسی تشبیہ سے مخدوش ہے۔ ورنہ لازم آتا ہے کہ جہاد میں بھی یہی تفصیل کرکے سب کا بھاگ جانا جائز ہو۔ بعض کا ناجائز ہو۔ اسی طرح یہ استدلال بھی تام نہیں کیونکہ وہ مقام لشکر کا مسکن نہ تھا۔ عارضی قیام گاہ تھی۔ اور فرار مسکن سے حرام ہے نہ کہ عارضی قیام گاہ سے مثلاً کوئی شخص مسافر ہوکر کسی مقام پر جائے۔ اور طاعون شروع ہو جائے تو وہاں پر رفع طاعون تک قیام کرنا اس پر واجب نہیں۔ دوسرے یہ کیا معلوم ہے کہ حضرت عمر نے طاعون کی وجہ سے اُن کو انتقال کا حکم دیا۔ ممکن ہے کسی دوسری وجہ سے حکم دیا ہو۔ کیونکہ لشکر تو ہوتا ہی ہو تبدل و تفرج کے لئے اس لئے استدلال تام نہیں۔ راجح اور صحیح یہی ہے کہ ان علل کا حکم میں کوئی اثر نہیں بلکہ اقرب العلل وہ ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ چونکہ اس میں کفار جن[1] سے مقابلہ ہے۔ اس لئے فرار ناجائز ہے۔ البتہ اتنی گنجائش ہے کہ جس شہر میں طاعون ہو

[1] اس مضمون کی مزید تحقیق و تفصیل اُس ملفوظ میں ہے۔ جو وعظ کے اخیر میں ملحق ہے۔ ضرور دیکھیے ۱۲ منہ

وہاں بستی سے نکلکر فنا شہر میں آ پڑیں۔ ہمارے اکابر نے بھی اتنی اجازت دی ہے گو یہ اجازت بھی اجتہادی ہے۔ اسمیں بھی اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ مگر ظاہراً اس کی ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔ اور اس کی نظیر یہ ہے کہ جیسے لشکر اسلام کا خرگاہ اسی میدان جنگ میں بدل دیا جاوے تو یہ فرار نہیں ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ بلد مع فنا ربقعہ واحدہ ہے اس کے ہر جزو میں رہنا اس بقعہ ہی میں رہنا ہے۔ آگے فرماتے ہیں من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے۔ یہاں قرض حسن سے وہ معنی مراد نہیں جو عوام میں مشہور ہیں۔ عوام بے سودی قرض کو قرض حسن کہتے ہیں جس میں اتنا ہی ملتا ہے جتنا دیا تھا۔ بلکہ قرض حسن سے مراد وہ ہے کہ خلوص محبت کے ساتھ طوع و رغبت سے دے پھر اس کا معاوضہ مساوی نہ ملے گا۔ بلکہ بہت زیادہ ملے گا۔ جیسا کہ ابھی آگے آتا ہے تو مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں تو قرض حسن بلا زیادت ہے۔ اور خالق کے ساتھ معاملہ کرنے میں قرض حسن قرض مع الزیادت ہے۔ یہاں ایک بات طالب علموں کے کام کی ہے وہ یہ کہ اس آیت کے ربط میں لوگوں کو اشکال پیش آیا ہے۔ کہ ماقبل سے اس کا کیا ربط ہے مشہور یہ ہے کہ اوپر بذل نفس کا ذکر تھا۔ یہاں بذل مال کا ذکر ہے۔ اور قتال میں دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز تہیو للقتال میں اصلاح ہے نفس کی اور اس اصلاح نفس میں بذل مال کو بھی بڑا دخل ہے۔ بلکہ بعض لوگ بذل نفس کے لئے تو تیار ہوتے ہیں مگر بذل مال ان پر گراں ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی مذاق کے ایک شخص کا قول ہے ؎

گر جان طلبی مضائقہ نیست ‌‌‌‌ ‌‌ ‌ ‌ ‌‌ ‌‌‌‌ ور زر طلبی سخن درین است

ممکن ہے شاعر کا خود یہ مذاق نہ ہو۔ اس نے دوسروں کا مذاق بیان کیا ہو تو بہت لوگ اس مذاق کے بھی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے مجاہدہ ببذل النفس کے ساتھ ہر جگہ تقریباً مجاہدہ ببذل المال کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ تاکہ اصلاح کامل ہو جائے۔ اور نسخہ مکمل ہو جائے یہ ربط بہت عمدہ ہے۔ مگر اس کی ضرورت اسی وقت ہے جبکہ قرض کا استعمال بذل نفس میں نہ ہو سکتا ہو نہ حقیقۃً نہ مجازاً۔ ورنہ اس کو بذل مال کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں میں اس کو عام کہوں گا۔ اور اس صورت میں بذل نفس سے بے تکلف ربط ہو جائیگا کیونکہ

قرض میں بذل نفس بھی داخل رہے گا۔ خواہ حقیقتاً خواہ مجازاً مطلب یہ ہوگا۔ کہ اوپر بذل نفس کی ترغیب بصورت امر تھی۔ یہاں دوسرے عنوان سے اسُی کی ترغیب ہے کہ تم اپنی جان اللہ تعالیٰ کو ادھار ہی دیدو۔ پھر تم کو ہی معہ الزیادت واپس دیدی جائے گی۔ مگر میں اس تفسیر پر اس لئے جرأت نہیں کرتا۔ بلکہ صرف احتمالاً اس توجیہ کو بیان کر رہا ہوں کہ مجھے لغت یا محاورہ کی تحقیق نہیں کہ قرض کا استعمال بذل نفس میں ہو سکتا ہے یا نہیں فیضاعفہ لہ اضعافا کثیرہ ط یعنی پھر اللہ تعالیٰ اسُ قرض کو بڑھا کر ادا کریں گے۔ دونے چوگنے کر کے دیں گے۔ دوسری آیت سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ سات سو تک بڑھائیں گے۔ مگر اس آیت میں بقرینہ سبب نزول اضعافا کثیرہ سے سات سو سے بھی زیادہ مراد ہے۔ کیونکہ لباب النقول میں اس آیت کے تحت میں ایک حدیث لکھی ہے کہ جب آیت مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ نازل ہوئی جس میں سات سو تک تضاعف کا ذکر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رب زدنی اے اللہ ہمیں اس سے بھی زیادہ دیجئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ اضعافاً کثیرۃ ط معلوم ہوا اس آیت میں سات سو سے زائد تضاعف کا ذکر ہے۔ اس بناء پر کم از کم سات سو سے دُگنا تو ہوگا۔ اور اگر اضعاف کی جمعیت اور اسُ کے اتصاف بالکثرت پر نظر کی جاوے تو پھر کچھ حد ہی نہیں رہتی اور ایک حدیث سے تو صریح معلوم ہوتا ہے کہ واقعی تضاعف فوق المتعارف ہے وہ حدیث یہ ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی راہ میں ایک چھوارہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے یمین میں لے کر اس کی پرورش فرماتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جبل احد سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے تو اب خیال کیجئے کہ جبل احد میں اگر تمر کے مساوی حصے فرض کئے جاویں تو کتنے اجزا نکل سکتے ہیں اور ان کا کیا عدد ہوگا۔ پھر اگر وہ حصے تمر کے مساوی فی الوزن فرض کئے جاویں تو اور بھی زیادہ عدد بڑھ جاویگا پھر حضور صلعم فرماتے ہیں کہ احد سے بھی زیادہ ہوگا تو معلوم ہوا کہ تضاعف کی کوئی حد نہیں بلکہ لاالی النہایۃ ہے۔ مگر یہ لاتناہی نفی تناہی متعارف ہے لاتناہی عقلی نہیں پھر اگر قرض کو بذل مال کے ساتھ خاص رکھا جائے تب تو تضاعف میں کوئی اشکال

نہیں۔ اور اگر بذل نفس کیلئے بھی عام کہا جائے تو وہاں تضاعف کی کیا صورت ہے۔ کیا ایک جان کی ہزار جانیں ہو جائیں گی؟ سو اول تو قدرت حق سے یہ بھی بعید نہیں۔ اس پر مجھے مولانا کا شعر یاد آتا ہے ؎

نیم جان بستاند و صد جان دہد | انچہ در وہمت نیاید آن دہد

صد جاں دہد کے کیا معنی ہیں۔ بعض نے تو کہا ہے کہ جان تو ایک ہی ہو گی۔ مگر قوت سَو کے برابر ہوگی۔ مگر صوفیہ اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر حقیقۃً ایک جان کی سو جانیں ہو جائیں تو یہ بھی بعید نہیں۔ کیونکہ وہ دنیا میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھر آخرت میں اس کا وقوع مستبعد کیوں ہے حضرت قضیب البان کا قصہ ہے کہ کسی نے اُن کے متعلق کسی امر منکر کی قاضی شہر کو اطلاع دی۔ وہ درہ لیکر تعزیر کی نیت سے چلے۔ وہ سامنے اس طرح نمودار ہوئے کہ بجائے ایک قضیب البان کے ستر قضیب البان قاضی کے سامنے آگئے۔ اور کہا ان میں سے ایک کو پکڑ لو۔ جو تمہارا مجرم ہو قاضی صاحب یہ کرامت دیکھکر معتقد ہو گئے تو وہاں سچ مچ ایک جان کی سو جان اور ایک جسم کے سو جسم ہو گئے تھے۔ اسی طرح صوفی سوندھا ایک بزرگ ہندوستان میں ہوئے ہیں۔ اُن کے سامنے کسی نے کہا کہ ہندویوں کہتے ہیں کہ کرشن اوتار کے سَو بیبیاں تھیں اور وہ ایک وقت میں سب کے پاس ہوتا تھا۔ اور ہر جسم سے جدا کام کرتا تھا۔ گویا ایک کرشن کے سَو کرشن بن جاتے تھے۔ صوفی سوندھا نے کہا کہ نہ معلوم کیسی روایت ہی صحیح ہے یا غلط اور صحیح بھی ہو تو یہ کچھ کمال نہیں۔ پھر فرمایا ذرا اس املی کو تو دیکھو۔ مخاطب نے جو املی پر نظر کی تو ہر پتہ پر صوفی سوندھا نظر آئے۔ اُس کے سامنے بھی بیٹھے تھے۔ اور درخت کے ہر پتے پر بھی اُن کا جسم مع روح کے نظر آرہا تھا تو جب حق تعالیٰ نے تضاعف نفس کی کرامت اپنے بندوں کو دنیا میں بھی عطا کی ہے۔ اگر آخرت میں بھی اسکا وقوع ہو تو کیا عجب ہے۔ اور اگر اس کو مان لیا جائے تو پھر ایک حدیث کی شرح بے تکلف ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے مختلف دروازے ہیں۔ کسی دروازہ کا نام باب الصلوۃ ہے۔ کسی کا باب الزکوٰۃ۔ کسی کا باب الریان وغیرہ وغیرہ جس شخص میں جو عمل غالب ہوگا وہ اسی دروازہ سے بلایا جائیگا

ملہ یہ الفاظ حدیث شریف کی تفسیر ہے ترجمہ نہیں ۱۲ منہ

اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ گو اس کی ضرورت تو نہیں مگر کیا کوئی ایسا بھی ہوگا۔ جو ہر دروازہ سے بلایا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں بعضے لیسے بھی ہوں گے۔ وارجوان تکون منھم۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی انہی میں سے ہو گے۔ اب جو لوگ تضاعف فی النفس کے قائل نہیں وہ تو یوں کہتے ہیں کہ شخص واحد کو ہر دروازہ سے تشریفاً وتکریماً بلایا جائیگا۔ پھر وہ جس دروازہ سے چاہے گا۔ چلا جائے گا۔ مگر تضاعف نفس کی تقدیر پر یہ حدیث بیغبار ہو جائے گی۔ اور یوں کہا جائے گا کہ حق تعالیٰ بعض بندوں کو جسم و روح متعدد عطا فرمائیں گے حقیقت میں وہ ایک شخص ہوگا۔ مگر تعدد جسد سے وہ متعدد ہوگا۔ اس لئے وہ ہر دروازہ سے بلایا جائے گا۔ اور ہر دروازہ سے الگ الگ جائے گا بھی۔ اور صاحبو! جب حق تعالیٰ کے یہاں بذل مال میں تضاعف ہوتا ہے جو نفس کے اعتبار سے اخس وارذل ہے تو بذل نفس میں تضاعف کیوں نہ ہو۔ جو اشرف واعلیٰ ہے اسی کو ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگرست

اور اس تعدد جسد کے احتمال پر اور ایک مضمون سہل ہو جائے گا وہ یہ کہ حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایک جنتی کے پاس اس قدر حور و قصور ہوں گے جو حد بصر سے بھی زیادہ۔ تو ظاہراً اس کا انتفاع بھی ان سب سے مدتوں کے بعد ہوا کرے گا لیکن اگر اجساد میں تعدد ہو تو ایک ہی وقت میں ہر نعمت ولذت سے متمتع ہو سکنا سہل ہو جاویگا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ المآل۔

آگے ارشاد ہے وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ اس میں ایک اشکال کا جواب ہے کہ تم اس تضاعف کو مستبعد نہ سمجھو۔ کیونکہ قبض وبسط اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ جس کی چاہے روزی کم کر دیتے ہیں۔ اور جس کی چاہیں روزی فراخ کر دیتے ہیں۔ پس وہ اس تضاعف لاالی النہایۃ پر بھی قادر ہیں۔ اگر قرض کو عام لیا جائے تو یہ قبض وبسط نفس کو بھی عام ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہاری جان کو سمیٹتے ہیں۔ اور وہی اس کو پھیلا بھی سکتے ہیں کہ بجائے ایک کے ہزار جانیں کر دیں اور یا اس میں تشجیع ہے۔ بذل نفس ومال پر کہ بخل اور خوف بیکار ہے۔ کیونکہ مال کا قبض وبسط اسی

طرح جان کا قبض وبسط خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر تم نے مال یا جان کو بچانا چاہا۔ اور انہوں نے قبض کرنا چاہا تو تمہاری تدبیر ہرگز نہ چلے گی۔ پھر غیر مشروع بخل وجبن فضول ہے۔ آگے ارشاد ہوا الیہ ترجعون اسمیں بذل مال ونفس کی ترغیب بھی ہے کہ تمکو وہاں جانا ہی تو اسکی جزا پاؤ گے اور بخل وجبن پر ترہیب بھی ہے کہ اگر ایسا کروگے تو وہاں جا کر سزا پاؤ گے اور نیز اسمیں اس قرض سے جو ایک مانع پیش آتا ہو اس مانع کو رفع کیا گیا ہو مثلاً مال خرچ کرنیسے یہ امر مانع ہوتا ہے کہ انسان سوچتا ہے کہ یہ مال میرے پاس رہتا تو اس سے بہت کام نکلتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ہی یہاں رہنے والے نہیں ہو۔ بلکہ ایک دن خدا کے پاس جانے والے ہو۔ تو مال تمہارے پاس کیوں کر رہ سکتا ہے۔ ایک نہ ایک دن اس کو چھوڑ کر جاؤ گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس کو خزانہ عامرہ میں داخل کردو۔ جہاں سے اضعافاً مضاعفہ ہوکر تم کو واپس مل جائے گا۔ اور اگر لفظ قرض کو بذل نفس کے لئے بھی عام مانا جاوے تو اس جملہ میں بذل نفس کی بھی ترغیب ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جان دینے سے بخل نہ کرو۔ کیونکہ ایک دن تم کو جانا ہی ہے تو بہتر یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان چلی جائے۔ اور تم کو شہادت نصیب ہو جائے جس کا صلہ یہ ہے کہ نفس میں بھی تضاعف ہوگا۔ ایک جان کے بدلے تم کو ہزار جانیں ملیں گی اور نیز یہ مضمون الیہ ترجعون کا ایسا ہے کہ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو طاعون سے وحشت بالکل نہ ہو۔ لوگوں کو یوں سمجھا لیا جائے کہ ایک دن موت ضرور آئے گی۔ بھاگنے سے بھی جان بچ نہیں سکتی۔ اور یہاں رہ کر موت آئی تو شہادت نصیب ہوگی۔ اور جہاد کے برابر ثواب ملیگا۔ پھر بھاگنا فضول ہے۔ اور واقعی موت ایسی چیز ہے کہ تدبیر سے ٹل نہیں سکتی۔ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔ قل لن ینفعکم الفرار ان فررتم من الموت او القتل واذا لا تمتعون الا قلیلا۔ کہدیجئے کہ بھاگنا تم کو ہرگز نفع نہ دے گا۔ اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے اور (بھاگ کر چند روز کو بچ بھی گئے تو) بجز قلیل مدت کے تم زندگی سے (زیادہ) متمتع نہیں ہو سکتے۔ اس کے مناسب بعض واقعات ذکر کرتا ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ کہ ایک بستی میں بھیڑیا آتا تھا۔ لوگ اس سے بہت خائف تھے۔ ایک عورت کی مارے خوف کے یہ حالت ہوئی کہ باوجود سخت گرمی کے اپنے بچے کو کوٹھڑی کے اندر لیجا کر سوئی

اتفاق سے رات کو چوروں نے اس کوٹھڑی میں نقب دیا۔ مگر آدمی کے سانس کی آواز سن کر بھاگ گئے اور اسی نقب میں سے بھیڑیا آکر بچہ کو لے گیا۔ اور اس عورت کی وہی تدبیر جو بھیڑیے سے بچنے کے لئے کی گئی تھی۔ بچہ کی ہلاکت کا سبب ہوگئی۔ ایک جگہ ایسا قصہ ہوا کہ سات آدمی سفر کو جارہے تھے۔ راستہ میں بارش ہونے لگی۔ تو ان لوگوں نے ایک بستی میں پناہ لی بارش کے ساتھ بجلی اور کڑک بھی تھی اور بجلی بار بار اس بستی پر آتی تھی اور ہٹ جاتی تھی۔ ان سات آدمیوں کو جہل سے یہ خیال ہوا کہ شاید ہم میں سے کسی کی موت آگئی ہے جس پر بجلی گرنا چاہتی ہو مگر چونکہ سب کی موت مقدر نہیں اسلئے ہٹ جاتی ہے۔ تاکہ ایک کے ساتھ سب ہلاک نہوں یہ سوچکر سب نے مشورہ کیا کہ بھائی ایک ایک کرکے سب کو اس بستی سے نکلنا چاہیے تاکہ جسکی موت آئی ہو بجلی اسی پر گر پڑے سب تو ہلاک نہ ہوں چنانچہ ایک ایک آدمی نکلا جب چھ نکل آئے اور ان میں کوئی ہلاک نہ ہوا تو اب ساتواں نکلنے سے رک گیا وہ سمجھا کہ بس میرے ہی واسطے موت مقدر ہے ہرچند سب نے اصرار کیا مگر وہ انکار ہی کرتا رہا آخرکار یہ چھ آدمی بستی میں گھسے اور اسکو جبراً باہر نکالا وہ باہر آیا اور یہ چھ آدمی اندر رہے کہ دفعتہ بجلی بستی کے اوپر گری وہ چھ کے چھ آدمی ہلاک ہوگئے اور ساتواں بچ گیا تھا۔ انہوں نے تو اپنے بچنے اور ساتویں کے مارنے کی تدبیر کی تھی۔ مگر یہ خبر نہ تھی کہ ہم اپنے ہی کو ہلاک کرنے کی تدبیر کر رہے ہیں۔ ساتویں کو بچانے کیلئے بستی سے نکال رہے ہیں۔ یہ ساتواں شخص ان سب کا وقایہ تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ سب بچے ہوئے تھے۔ جب یہ الگ ہوگیا۔ سب ہلاک ہوگئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ سنا تھا۔ کہ ایک مکان میں بہت سے چور گھسے گھر میں جاکر دیکھا۔ کہ ایک میاں اور ایک بیوی اندر پڑے سو رہے ہیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ ان دونوں کا پلنگ باہر نکال دیا۔ تاکہ اطمینان سے چوری کریں۔ ان دونوں کا پلنگ باہر کرکے جو یہ لوگ اندر گھسے تو دفعتہ مکان کی چھت گر پڑی۔ اور سب وہیں دب کر مر گئے۔ وہ مرد عورت جو جاگے تو دیکھا ہمارا پلنگ اندر سے باہر ہے اور مکان کی چھت گری پڑی ہے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ ہمارا پلنگ باہر کیسے آگیا۔ جب تختہ کڑی ہٹایا گیا تو چوروں کی لاشیں برآمد ہوئیں اب وہ ان چوروں کے آنے پر خدا کا شکر کرنے لگے۔ حالانکہ چوروں سے تو پناہ مانگا کرتے ہیں۔ غرض ایسے بہت واقعات ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ موت سے بچنا ممکن نہیں۔ اور جو اسباب موت سے

بچنے کے لئے ہم اختیار کرتے ہیں۔ وہ فی نفسہ مؤثر نہیں بلکہ بعض دفعہ وہی ہلاکت کا سبب ہو جاتے ہیں۔ تو بھاگنے ہی سے کیا ہو گا بس جو کچھ ہوتا ہے۔ حکم سے ہوتا ہے۔ پھر فکر کیوں ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ طاعون سے بچنے کی اگر تدبیر ہی کرنا چاہتے ہو تو بڑی تدبیر یہ ہے کہ فکر نہ کرو جس کا لازمی نتیجہ عدم فرار ہو گا۔ کیونکہ اطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ اصل فاعل اور دافع مرض طبیعت ہے۔ اور اصل علاج طبیعت کو قوی کرنا ہے۔ اور اصل سبب مرض ضعف طبیعت ہے۔ اور ضعف طبیعت کا بڑا سبب خوف اور فکر ہے۔ پہلے زمانہ میں جو امراض کم ہوتے تھے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت عام طور پر بیفکری تھی۔ گو اسباب تنعم کم تھے بیفکری کے سبب ان لوگوں کے طبائع اور دل قوی تھے۔ اس لئے امراض پاس بھی نہ آتے تھے۔ اور آجکل گو اسباب تنعم زیادہ ہیں۔ مگر اس کے ساتھ افکار بھی زیادہ ہیں۔ اس لئے امراض کی بھی کثرت ہے۔ تو بیماری سے بچنے کی بڑی دوا بے فکری ہے۔ کیونکہ اصل دافع مرض طبیعت ہی ہے اور اس کو بے فکری سے قوت ہوتی ہے۔ اور اس مسئلہ طبیہ کی صحت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ طرق علاج معالجین میں مختلف ہیں۔ اور سب ہی سے نفع بھی ہوتا ہے یعنی علاج تین قسم کے ہیں۔ ایک تو اٹکل پچو جس کا کوئی اصول ہی نہیں۔ وہ تو ڈاکٹری ہے۔ اس کا مدار کسی قاعدہ پر نہیں کہ علاج بالضد ہو یا بالمثل۔ بلکہ تجربہ پر مدار ہے۔ بس تجربہ ہو گیا کہ کنین دوائے امراض کو نین ہے۔ تو لگے ہر بخار میں کنین استعمال کرنے پھر غضب یہ کہ ان کی دوائیں سب بنی بنائی ولایت سے آتی ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ مرکب دوا کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ کہ اس میں کیا ہے کیا نہیں۔ بس ولایت سے چٹ لگ کر آگئی اور یہ ایمان بالغیب یا ایمان بالعیب سے علاج کرنے لگے۔ اور اگر کبھی چٹ لگانے میں غلطی ہو گئی۔ یا ڈاکٹر سے چٹ کے پڑھنے میں خطا ہو گئی۔ چنانچہ ایسا بھی ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر صاحب یہ کہکر الگ ہو گئے کہ ہم سے غلطی ہو گیا۔ ہم معافی مانگتا ہے ؎

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

اور ایک علاج گھڑت کا ہے جس کے اصول و ضوابط منضبط ہیں۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علاج بالضد جیسا کہ یونانی میں ہے۔ یہ گرمی کا علاج سردی سے اور

سردی کا گرمی سے کرتے ہیں۔ اور رطوبت کا یبس سے یبس کا رطوبت سے کرتے ہیں دوسرا علاج بالمثل ہے۔ یہ لوگ گرمی کا گرمی سے سردی کا سردی سے علاج کرتے ہیں اور ان دونوں میں سخت اختلاف ہے۔ ہر ایک دوسرے کے علاج کو غلط بتلاتا ہے۔ اب اگر دوا فاعل ہوتی اور اسی سے مرض دفع ہوا کرتا تو ان طرق میں سے ہر اک نافع نہ ہوتا بلکہ جس کے اصول صحیح ہوتے اس سے نفع ہوتا۔ اور جس کے اصول غلط ہوتے اس سے ضرر ہوتا۔ اور چونکہ اصول میں تخالف وتبائن ہے۔ اس لئے دونوں یقیناً صحیح نہیں۔ بلکہ ان میں ضرور ایک غلط ہے۔ مگر مشاہدہ ہے کہ دونوں سے نفع ہوتا ہے۔ اور ڈاکٹری سے بھی نفع ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہی بات صحیح ہے کہ اصل دافع مرض طبیعت ہے۔ دوا فاعل صحت یا دافع مرض نہیں۔ سو جس شخص کو جس طریق علاج سے اعتقاد ہوتا ہے۔ اس علاج کے شروع ہو جانے سے اس کی طبیعت کو قوت شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے کہ اب میں اچھا ہو جاؤنگا۔ اس اعتقاد سے طبیعت کو قوت ہوئی۔ اور مرض زائل ہونا شروع ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ بےفکری سے طبیعت کو بہت قوت ہوتی ہے۔ پس طاعون کا بڑا علاج یہ ہے کہ فکر نہ کرو تم کو اپنی قوت قلب کی تاثیر کا اندازہ نہیں ہے۔ ورنہ یہ قوت قلب وہ چیز ہے کہ اس سے امراض بھی ڈرتے ہیں۔ اور جن وشیاطین بھی ڈرتے ہیں۔ دیکھو انگریزوں پر آسیب اور بھوت کا اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ان کے منکر ہیں۔ ان کے وجود کے قائل ہی نہیں ہیں اور ہندوں پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ ان کی تاثیر کے قائل ہیں۔ اس لیے ان سے ڈرتے بھی ہیں۔ اور ہندوؤں سے کم جاہل مسلمانوں پر اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہندوؤں کے برابر تو ان کے قائل نہیں مگر اختلاط کی وجہ سے جہلاء کا کچھ کچھ اعتقاد ہے۔ پس جتنا جو شخص ان سے ڈرتا ہے۔ اتنا ہی اس پر اثر ہوتا ہے اور جو بےفکر ہے اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ مگر بےفکری کی تحصیل کیلئے حقائق کا انکار جائز نہیں جیسے اہل یورپ کہ وجود جن ہی کے منکر ہیں بلکہ بےفکری اس طرح بھی ہو سکتی ہے۔ کہ جن بدوں اذن الٰہی کے کچھ نہیں کر سکتے۔ البتہ جس حقیقت ہی کا ثبوت شرع سے نہ ہو۔ وہاں انکارِ حقیقت اعلیٰ طریق ہے بےفکری کا۔ جیسا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لاعدوی کہ کوئی بیماری (طاعون وغیرہ) دوسرے کو

نہیں لگتی۔ تو جس شخص کا یہ اعتقاد ہوگا۔ طاعون سے کس قدر بے خوف ہوگا۔ کوئی طبیب اس سے اچھا علاج نہیں بتلا سکتا۔ بہر حال اگر تدبیر ہی کرنے کا شوق ہے تو یہ عدم فکر ہی بڑی تدبیر ہے مگر اس تدبیر میں یہ وہم نہ کرنا کہ شاید شیاطین و جن بھی بے فکری کا سبق سیکھ لیں تو پھر انکو بھی قوت ہو جائیگی۔ جیسے مثنوی میں ایک قصہ ہے کہ ایک لڑکے سے اسکی ماں نے کہا کہ بیٹا جنگل میں بھوت پریت دیکھو تو اُنسے ڈرنا نہیں۔ خوف نہ کرنیسے وہ خود بھاگ جائیں گے۔ بچہ نے کہا کہ اگر اسکی ماں نے بھی اس کو یہی سکھا دیا ہو کہ انسان سے ڈرنا نہیں۔ تو بھلا پھر وہ کیوں بھاگے گا لڑکا بڑا ہوشیار تھا۔ تو خدا کے لئے آپ اس وہم سے کام نہ لیں اور بے فکر ہو کر رہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ چین سے رہو گے۔ شیاطین میں اتنی قوت نہیں کہ وہ آپ سے یہ سبق سیکھ کر بے خوف ہو کر رہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شریعت نے جو طاعون سے فرار کو منع فرمایا ہے یہ تدبیر کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب سے بڑی تدبیر ہے اس سے محفوظ رہنے کی۔ چنانچہ دوسری تدابیر کو بھی منع نہیں فرمایا۔ چنانچہ حفظ ماتقدم کے لئے گولیاں کھانا اور گندک کی دھونی دینا جائز ہے۔ بلکہ ایسا کرنا چاہئے۔ اسیطرح مکان کی صفائی رکھنا چاہئے۔ پاخانہ میں فنائل بھی چھڑک دیا کرو۔ کوئی بیمار ہو جائے اُس کی دوا دارو بھی کرو۔ اور سب سے بڑی تدبیر یہ بھی کرو۔ کہ فکر نہ کرو۔ اس سے طبیعت اور قلب میں قوت ہوگی۔ جس سے مرض دفع ہوگا۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اطباء و ڈاکٹر جو مقام طاعون سے بھاگنے کی اور اس کے مریض سے الگ رہنے کی رائے دیتے ہیں۔ وہ دراصل انسان کو مرض کا قابل بناتے ہیں۔ کیونکہ بھاگنے والے کا دل کمزور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص طاعونی مریض سے پرہیز کریگا۔ وہ بھی ضعیف القلب ہوگا تو یہ لوگ طبیعت کے ضعیف کرنے کا سامان کر رہے ہیں۔ اور ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاعدوی فرما کر مسلمانوں کی طبائع کو قوی بنا کر اُن طبائع کو فاعل صحت اور دافع مرض بنا رہے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس پر پورا اعتقاد کریں۔ کیونکہ واقعی اس سے بڑھ کر تقویت قلب کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ لوگوں کے دلوں میں یہ مضمون جما دیا جائے کہ بیماری لگتی نہیں ہے۔ جس کا یہ اعتقاد ہوگا۔ وہ نہایت قوی القلب ہوگا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرار کی ممانعت کر کے بھی مسلمانوں کو قوی القلب بنانا چاہا ہے کہ طاعون سے ڈرو نہیں بے فکر ہو کر وہیں رہو۔ اور یہ سمجھ لو کہ جو کچھ ہوگا حکم سے ہوگا جس کی موت آچکی ہے وہی مرے گا جس کی نہیں آئی وہ ہرگز نہیں مر سکتا۔ پھر طاعون کے

فضائل بیان فرماکر انکو اور موکد کردیا کہ بجائے خائف ہونیکے مسلمانوں کو طاعون کا مشتاق بنادیا اسی تدبیر تقویت طبیعت کا تتمہ ایک یہ تدبیر ہے کہ باہم بیماری کا تذکرہ نہ کرو کہ آج اتنے بیمار ہوئے اور اتنے مرے اس سے طبیعت کمزور ہوتی ہے خصوصاً عورتوں کو چاہئے کہ اپنے گھروں میں اس تذکرہ کو بند کریں انکے ہاں راوی اس کثرت سے ہیں کہ مردوں کو تو باہر کے واقعات کی خبر کم ہوتی ہے۔ مگر اس خفیہ پولیس کو ساری خبریں ملتی رہتی ہیں۔ نہ معلوم ان سے کون کہہ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اول تو تفویض و تسلیم کی نیت سے ہم کو بے فکر ہونا چاہئے اور اگر کسی کو تفویض و تسلیم حاصل نہیں تو وہ تدبیر ہی کی نیت سے بےفکری کو اختیار کرے اس سے مادہ قابلہ طبائع میں سے نکل جائے گا۔ تو طاعون خود ہی جاتا رہیگا پھر اس میں دنیا کی بھی راحت ہے کہ سارے کام اپنے اپنے موقع پر ادا ہوتے رہتے ہیں۔ اور پریشانی سے سارے کام خراب ہوتے ہیں۔ اور دین کا بھی نفع ہے۔ کیونکہ جو شخص بےفکر ہوگا اگر اُسے موت بھی آئے گی۔ تو اطمینان سے توبہ و استغفار کرکے مرے گا۔ اور فکرمند کے تو مرض ہی سے حواس باختہ ہوجائیں گے۔ موت کو دیکھ کر تو نہ معلوم کیا حال ہوگا مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ علم الصیغہ کے مصنف حج کو تشریف لے گئے تھے شاید واپسی کے وقت جہاز طوفان میں آگیا بعض مسافر جو اس جہاز سے بچکر نکل آئے تھے وہ کہتے تھے کہ جس وقت جہاز غرق ہونے لگا تو تمام مسافروں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ مگر مفتی عنایت احمد صاحب بڑی بےفکری سے بیٹھے ہوئے یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون ط بتلائیے طوفان کے وقت جبکہ معلوم ہے کہ جہاز غرق ہونے والا ہے۔ ایسا استقلال کس چیز کی بدولت تھا۔ اسی بےفکری کی بدولت مگر انہوں نے یہ بےفکری تدبیر کے طور پر اختیار نہ کی تھی۔ بلکہ رضا و تسلیم کا اثر تھا۔ لیکن اگر کوئی تدبیر کے طور پر بھی بےفکری اختیار کرے۔ تو راحت نفس اس کو بھی میسر ہوجاوے گی۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور خلاصہ بیان کا اعادہ کرتا ہوں۔ حاصل سارے بیان کا یہ ہے کہ عام لوگوں کو جو اس وقت پریشانی اور بدحواسی ہے اس کا سبب حق تعالیٰ سے بےتعلقی ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے تعلق محبت پیدا کیا جائے۔ جس کا طریقہ میں نے یہ بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کو کثرت سے یاد کیا جائے۔ اور ایک وقت ذکر اللہ کے لئے مقرر کیا جائے۔ اور اہل اللہ کی

صحبت اختیار کی جائے۔ اس طرح سے انشاء اللہ تعالیٰ چند روز میں محبت پیدا ہو جائے گی۔ چاہے آپ متقی پرہیزگار بھی نہ بنیں۔ مگر عاشق و محب ضرور ہو جائیں گے۔ بس اب مجھے یہ کہنا تھا۔ اور اس مضمون کو میں نے اس لئے اختیار کیا تھا۔ کہ مجھے قوی امید ہے کہ لوگ اس کو تو ضرور قبول کرینگے۔ کیونکہ میں یہ نہیں کہتا کہ تم آج ہی سے سارے گناہوں کو چھوڑ دو۔ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ آج سے ہی سب کے سب پکے نمازی بنجاؤ بلکہ صرف یہ کہتا ہوں کہ خدا کی نعمتوں کو روزانہ یاد کر لیا کرو۔ اور کسی وقت تھوڑی دیر اللہ اللہ کر لیا کرو۔ اور تھوڑی دیر اللہ والوں کے پاس جا بیٹھا کرو۔ چاہے اسکے ساتھ شرارت بھی کر لیا کرو انشاء اللہ تعالیٰ شرارتوں کے ساتھ بھی تم عاشق بن جاؤ گے۔ اور عشق کی یہ خاصیت ہے کہ ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت — ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

وہ تمام پریشانیوں کو جلا پھونک کر رکھدے گا۔ اور آپ ایسا کر کے تو دیکھیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ایک ہفتہ میں طاعون ہی نہ رہے گا۔ کانپور میں ایک دفعہ میرے سامنے جب طاعونی انتظامات کا حکم آیا تو لوگ بہت پریشان ہوئے اور عمائد شہر نے ارادہ کیا کہ کلکٹر صاحب کے پاس ایک وفد جائے اور جاکر عرض کرے کہ ان انتظامات کو اٹھالیا جائے۔ اس وفد میں لوگوں نے مجھے بھی لے جانا چاہا۔ میں نے انکار کیا۔ لوگوں نے اصرار کیا۔ میں نے کہا اچھا۔ میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کر لوں۔ اس وقت میرے پاس دیوان حافظ تھا۔ اور میں اکثر تفریح طبع کے طور پر اس سے فال لے لیا کرتا ہوں۔ جس میں میرا یہ اعتقاد نہیں کہ نعوذ باللہ حافظ صاحب آکر کچھ کہہ جاتے ہیں۔ بلکہ یہ خیال ہے کہ یہ کلام ایک مقبول بندہ کا ہے اللہ تعالیٰ اس میں ہماری تسلی کے لئے کوئی بات موقعہ کے مناسب نکال دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بسم اللہ کر کے دیوان کو کھولا تو شروع ہی صفحہ پر یہ شعر تھا ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش — رموز مملکت خویش خسروان دانند

کیسا موقع کا شعر نکلا۔ میں نے کہا صاحبو مجھے تو اس شور و شغب میں شرکت سے منع کیا گیا ہے۔ کہ فقیر کو امور سلطنت میں دخل نہ دینا چاہیئے۔ لوگوں نے کہا۔ پھر ہمارے واسطے کیا رائے ہے۔ میں نے کہا تم بھی حکام سے کچھ نہ کہو خدا تعالیٰ سے کہو اور تم روزانہ پانچسو مرتبہ

؎ افسوس اس ارشاد پر لوگوں نے عمل نہیں کیا ۱۲ ظ

لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا وظیفہ پڑھ لیا کرو۔ خواہ دو تین آدمی پڑھ لیں یا بہت سے مجتمع ہو کر پڑھ لیں۔ اس کے بعد حق تعالیٰ سے دعا کریں۔ اس وقت میری زبان سے یہ بھی نکل گیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایک ہفتہ میں یہ بلا ٹل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ ایک ہی ہفتہ کے اندر خود کلکٹر نے لکھدیا کہ یہاں طاعون وغیرہ کا کوئی اثر نہیں۔ اس لئے جدید انتظام کا حکم موقوف کیا جائے۔ اسی طرح میں خدا کے بھروسہ پر یہاں بھی کہتا ہوں کہ آپ اس طریقہ پر عمل کر کے دیکھیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ایک ہفتہ میں سکون ہو جائے گا۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی محبت عطا فرمائیں۔ اور پریشانیوں کو دور فرمائیں۔ وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین +

الملفوظ المسمّٰی بہ

الطاعون لمن فر من الطاعون

مورخہ ۱۱۔ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ

بعد نماز جمعہ بسلسلۂ ذکر طاعون فرمایا

کہ طبی تحقیق میں اصل فاعل صحت طبیعت ہے۔ اور علاج اس کا موید ہے۔ چنانچہ علاج کے تین طریقے متعارف ہیں۔ علاج بالضد تو یونانی کرتے ہیں۔ اور علاج بالمثل ہندی کرتے ہیں۔ اور علاج بالخاصہ ڈاکٹر کرتے ہیں۔ اور اس کا مدار نہ مثل پر ہے۔ نہ ضد پر بلکہ تجربہ پر ہے۔ خواہ بالمثل ہو خواہ بالضد اس کا کچھ لحاظ نہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ کونین بخار کو مفید ہے بس لیکن یہ طریق مہمل ہے۔ بہر حال عقلاً سب طریق صحیح نہیں ہو سکتے۔ کہ باہم متنافی ہیں مگر پھر بھی سب نافع ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل دافع مرض طبیعت ہے چونکہ ہر طریق کا نافع سمجھنے والا اس کا معتقد ہے۔ اس سے اس کی طبیعت میں قوت ہوتی ہے اس سے مرض دفع ہو جاتا ہے۔ اور اصل فاعل طبیعت ہے۔ تو جس قدر طبیعت قوی ہو گی اسی قدر مرض کو دفع کرے گی۔ تو صاحب شریعت نے طبیعت کے قوی بنانے کا کیا عجیب انتظام

فرمایا۔ کیونکہ ارشاد فرمایا۔ لاعدوی۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ عقیدہ ہوگا۔ اس کی طبیعت نہایت قوی ہوگی۔ اور وہ مرض کی کچھ پروا نہ کریگا بخلاف اس کے ضعف میں اتنا ہی مرض سے تاثر ہوگا۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں قاری عبداللہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ کسی مقام کے ایک نواب صاحب کی بیوی حج کو آئی تھیں۔ بیمار ہوگئیں کسی وبائی مرض میں تو نواب صاحب بہت پریشان ہوئے۔ دوسرے روز حرم شریف میں ایک جنازہ آیا تو ہم نے سمجھا کہ نواب صاحب کی بیوی بیمار تھیں۔ انہیں کا انتقال ہوگیا ہوگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نہیں نواب صاحب خود انتقال کر گئے۔ اور ان کی بیوی بعد میں اچھی ہوگئیں۔ یہ نواب صاحب کی پریشانی اور کمزوری طبیعت کی وجہ ہوئی۔ ہمارے ایک مولوی صاحب جنہوں نے بہشتی زیور تالیف کرنا شروع کیا تھا۔ ان کی بیوی بیمار ہوئیں طاعون میں مولوی صاحب چونکہ نہایت ضعیف القلب تھے بہت پریشان ہوگئے۔ بیوی کو تو صحت ہوگئی۔ مگر مولوی صاحب اس مرض میں مبتلا ہوکر انتقال فرما گئے۔ اور قوت قلب کا یہ اثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ بیمار رہے چھٹے رہے۔ اور کچھ نہیں ہوا۔ ایک حکیم صاحب تھے۔ امیر احمد نانوتوی ان کے یہاں بستی میں طاعون ہوا۔ برابر مریضوں کو دیکھنے جاتے اور دوا بنا کر دیتے اور مریضوں کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھکر دوا پلاتے۔ فرماتے تھے۔ دس فیصدی فوت ہوئے۔ اور نوے فیصدی اچھے ہوگئے اور حکیم صاحب کو کچھ بھی نہ ہوا۔ اچھے خاصے رہے۔ تو عقلاً بھی اس سے فرار مضر ہے کہ مورث ضعف ہے اور شرعاً تو منہی عنہ ہی ہے۔ چنانچہ فار من الطاعون کو فار من الزحف سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور اس میں جو طاعون کو جہاد سے تشبیہ دی گئی ہو اس کی وجہ دو چار دن ہوئے سمجھ میں آئی ہے۔ (ممکن ہے کسی کو اور وجہ معلوم ہو) تشبیہ تو ان حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے ایک حدیث تو یہ ہے۔ الفار من الطاعون کالفار من الزحف۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طاعون جہاد کی طرح ہے۔ اور طاعون سے بھاگنے میں ویسا ہی گناہ ہے۔ جیسا کہ جہاد سے بھاگنے میں۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن جو لوگ طاعون سے مرے ہیں۔ ان کے بارہ میں نزاع ہوگا۔ جو لوگ جہاد میں شہید ہوئے ہیں وہ لوگ تو یہ کہیں گے کہ طاعون والے ہمارے بھائی ہیں۔ ہمارے ساتھ رہیں۔ دوسرے لوگ

جو اور بیماریوں میں اپنے فرش پر مرے ہیں وہ کہیں گے کہ طاعون والے ہمارے بھائی ہیں ہمارے ساتھ رہیں۔ کیونکہ ہماری طرح فرش پر بیمار پڑ کر مرے ہیں۔ اس کے بعد حکم ہوگا۔ کہ ان کے زخموں کو ملاحظہ کیا جائے تو اُن کے زخم شہیدوں کے زخموں کی طرح ہوں گے۔ ویسے ہی خوشبودار ہونگے۔ اور اُن کے زخموں سے خون بہتا ہوگا۔ تو پھر وہ شہداء کے ساتھ ملادیئے جائیں گے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ طاعون والے شہداء کی طرح ہیں اور طاعون جہاد کے مشابہ ہے۔ اسی واسطے طاعون کے علاوہ اور کسی بیماری سے فرار کو نہیں منع فرمایا۔ اب وجہ تشبیہ کی بیان کرتا ہوں۔ وجہ تشبیہ کی سمجھنے سے پہلے یہ غور کیا جائے کہ جہاد میں جو فرار سے منع فرمایا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ یعنی جب مسلمان اور کافر تعداد میں برابر ہوں یا کافر مسلمانوں سے دوچند ہوں اور سامان وغیرہ بھی موجود ہو تو اس صورت میں فرار سے منع فرمایا ہے۔ گو کسی کو قرائن سے یہ بھی یقین ہو کہ کافر غالب ہو جائیں گے۔ تو بھی شریعت نے بھاگنے کی اجازت نہیں دی۔ گو عقل کا مقتضا یہ تھا کہ اس صورت میں جان کی حفاظت کرنا چاہیئے۔ اور پھر دوسرے وقت موقع پاکر جنگ کی جاوے۔ مگر شریعت نے علی الاطلاق فرار سے منع فرمایا۔ گو ایک مسلمان بھی اس میدان میں نہ بچے اور سب لوگ شہید ہو جاویں مگر فرار کی اجازت نہیں۔ تو وجہ عدم اجازت کی یہ ہے کہ فرار میں کفار کو حوصلہ ہو جائے گا۔ اور وہ سمجھیں گے کہ یہ لوگ کسی لائق نہیں۔ کچھ نہیں بے ہمت ہیں۔ اس سے کفار کا دل بڑھ جائیگا پھر مسلمانوں کو ایذا دینے کا۔ ان کو حوصلہ ہو جائے گا۔ اور اگر مسلمان نہ بھاگے خواہ غالب آگئے یا سب مارے گئے۔ تو دونوں صورتوں میں کفار کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ اور اُن کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔ اور یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑی سخت قوم ہے۔ جان دینا تو ان کو آسان ہے مگر ان کا بھاگنا مشکل ہے۔ تو غلبہ کی صورت میں بھی اور مغلوب ہو جانے کی صورت میں بھی۔ غرض دونوں صورتوں میں مسلمانوں کی ہیبت کفار کے دلوں پر بیٹھ جائے گی۔ اور آئندہ جنگ کرنے کا حوصلہ نہ کریں گے۔ اس واسطے فرار کو منع فرمایا ہے سبب جہاد سے فرار کے منع ہونے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ طاعون جہاد کی طرح ہے تو اب طاعون سے فرار کے منع ہونے کی وجہ سنئے۔ وہ یہ کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ الطاعون من

وخزِ الجن۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعون شیاطین کے طعن اور ایذا سے ہوتا ہے۔ اور حق تعالیٰ نے شیاطین کو کچھ قدرت دے رکھی ہے۔ کہ مسلمانوں کو کچھ ایذا دے سکیں جیسا قرآن میں ہے۔ رب انی مسنی الشیطٰن بنصب وعذاب باقی اور نصوص سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ تو گویا طاعون بھی کفار شیاطین سے ایک قسم کی جنگ ہے اور طاعون سے بھاگنے میں شیاطین کو حوصلہ ہو جائے گا۔ کہ مسلمان ہم سے ڈر گئے اور آئندہ ایذا دینے اور اغوا کرنے کا حوصلہ ان کا بڑھ جائے گا۔ اسی واسطے وہیں رہنا چاہیے۔ جہاں طاعون ہے۔ بھاگنا نہ چاہیے۔ تاکہ شیاطین کا حوصلہ نہ بڑھے۔ پس بعض علماء نے (مثلاً در مختار میں) جو یہ لکھا ہے کہ اگر اعتقاد فاسد نہ ہو تو بغرض علاج وہاں سے چلا جانا جائز ہے۔ جب کہ یہ نیت ہو کہ یہ جانا بطور علاج ہے اور موت و حیات اللہ کے قبضہ میں ہے۔ البتہ جبکہ یہ نیت نہ ہو کہ جب جائیں گے تب بچ جائیں گے۔ اور رہ جائیں گے۔ تو مر جائیں گے تو اس صورت میں جانا جائز نہیں آہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اور نہ صاحب مذہب سے منقول ہے۔ یہ متاخرین کا استنباط ہے۔ کیونکہ اس تقریر سے تو ہر بیماری سے جانا منع ہونا چاہیے۔ کیونکہ فساد اعتقاد ہر حال میں ممنوع ہے۔ اور میری اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ طاعون میں علاج کرنا جائز ہے۔ کیونکہ جب طاعون جہاد کی طرح ہے تو جہاد میں فرار کے سوا باقی سب تدابیر جائز ہیں جیسے اسلحہ گولہ بارود ہر قسم کا انتظام اسی طرح طاعون میں بھی علاج اور ہر طرح کا انتظام جائز ہے۔ مگر یہاں بھی بھاگنا جائز نہیں۔ تاکہ شیاطین کو حوصلہ اور ہمت نہ ہو اور شیاطین کے مقابلہ میں قوت کی مطلوبیت کی طرف قرآن میں بھی اشارہ ہے مگر لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حصر کے الفاظ سے فرمایا ہے۔ انما سلطانہ علی الذین یتولونہ الآیۃ (اور عجیب بات ہے کہ اور لوگوں کا غلبہ تو اپنے دشمنوں پر ہوتا ہے۔ مگر شیطان کا غلبہ اپنے ہی دوستوں پر ہوتا ہے۔ پس شیطان سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ اس سے دشمنی رکھے اور اس سے نہ ڈرے (اسی سلسلہ میں ابن عطا اسکندری کا نقل کیا ہوا۔ ایک واقعہ ذکر فرمایا) کہ کوئی بزرگ ایک پہاڑی میں رہتے تھے۔ ایک شخص الخ

ف قدر سندہ فی حاشیۃ اوائل الوعظ ۱۲

کی زیارت کو گیا۔ اس نے غار کے باہر سے سنا کہ انہوں نے اعوذ پڑھی۔ اور پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد فرمانے لگے۔ کہ اے شیطان تو خوش ہوا ہوگا۔ اور یہ سمجھتا ہوگا کہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں۔ اور تجھ سے ڈر کر ایسی بڑی ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں تو میرا کیا کر سکتا ہے۔ اور تو ہے ہی کیا۔ میں نے اعوذ صرف اس واسطے پڑھی ہے کہ میرے مالک کا حکم ہے۔ (اس کے بعد فرمایا) وساوس کا بھی علاج یہی ہے کہ شیطان کو کہدے کہ جا تو جو چاہے کر جب وسوسہ میں گناہ نہیں تو میں ان کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔

آن خداوندان کہ رہ طے کردہ اند

گوش با بانگ سگان کے کردہ اند

(از جامع) شاہجہاں پور میں ایک وعظ میں میں نے یہی کہا تھا۔ تو ایک آدمی دوسرے دن آیا۔ بہت دعا دینے لگا۔ اور بہت خوش ہوا۔ میں نے دریافت کیا کیا بات ہے۔ اس نے کہا کہ میں ہر روز ہزار بار درود شریف پڑھتا تھا۔ مگر رات کو گوہ موت کتے خنزیر اور بری بری چیزیں نظر آتی تھیں۔ اور جس دن نہیں پڑھتا تھا۔ اس دن خیر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے میں نہایت پریشان تھا۔ اور خیال ہوتا تھا کہ درود چھوڑ دوں۔ آپ کے وعظ سننے کے بعد میں نے شیطان سے کہدیا کہ تو خواہ کچھ بھی کر۔ خواہ گوہ میرے منہ میں ڈال دے تب بھی میں درود نہ چھوڑونگا۔ اس کے بعد میں نے خوب درود شریف پڑھا۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس واسطے جی نہایت خوش ہے۔ (اور فرمایا) طاعون چونکہ من وخز الجن ہے اور جن بھوت وغیرہ اذان سے بھاگ جاتے ہیں۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ اذا تغولت الغیلان نادی بالاذان۔ ان دونوں حدیثوں کو ملا کر بعض نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ طاعون کے موقع پر اذان کہی جائے۔ میں ان لوگوں سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر اذان پنجگانہ کافی ہے تو دوسری اذان کیوں کہتے ہو۔ اور اگر وہ کافی نہیں اس لئے کہ اس کے ختم پر پھر جن چلے آدیں گے تو دوسری بھی کافی نہ ہوگی۔ کیونکہ جب اذان کہو گے جن چلے جائیں گے۔ جب ختم کرو گے پھر واپس آجائیں گے۔ پھر فائدہ ہی کیا۔ نیز حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب غول متشکل ہوں اور تم کو نظر آئیں تو اس وقت اذان کہو۔ اور طاعون میں چونکہ

معلوم نہیں ہوتے اور نظر نہیں آتے۔ تو اذان بھی اس حدیث کا مدلول نہ ہوگی۔

(اس جگہ ایک مولوی صاحب نے عرض کیا) کہ جب طاعون جہاد کی طرح ہے۔ تو طاعون میں جانا بھی جائز ہوتا۔ بلکہ ثواب ملتا جیسے جہاد میں جانا۔ تو پھر طاعون کے موقع پر جانا کیوں جائز نہیں۔

(جواب عنایت فرمایا) کہ یہ سوال کام کا ہے۔ جواب یہ ہے کہ جہاد کے موقع پر جانا اس واسطے جائز بلکہ اولیٰ ہے کہ کفار کے دفع میں مفید ہے۔ اور طاعون کے موقع پر کچھ مفید نہیں اسواسطے جانا جائز نہیں ہے کہ عبث ہے۔

(ایک اہل علم نے عرض کیا) کہ مقام طاعون میں جانے کا بھی ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ شیطان کا حوصلہ پست ہوگا۔ کہ یہ ایسے نڈر ہیں کہ ایسی جگہ آگئے۔

(فرمایا) اس کا جواب پہلی تقریر میں نہیں دیا تھا۔ اب دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ مقام طاعون میں جانے کی صورت میں مفسدہ بھی ہے اور مصلحت بھی۔ اور مفسدہ و مصلحت جب دونوں جمع ہوں تو مصلحت کی رعایت نہیں کی جاتی۔ بلکہ مفسدہ کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ (اگر مطلق مصلحت کا لحاظ کیا جاوے تو ہر معصیت جائز ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں کچھ نہ کچھ مصلحت ضرور ہے۔ اور وہ مفسدہ یہ ہے۔ کہ ایسی جگہ جانا صورۃً جرأت علی اللہ اور القاء نفس فی التہلکہ ہے۔ جیسا کہ جب جہاد میں بھی اسباب موجود نہوں اور ہلاکت کا خطرہ غالب ہو۔ تو فقہاء نے جانا منع لکھا ہے کیونکہ اگر کوئی فائدہ بھی ہو مگر مضرت کا گمان غالب ہے اور اعتبار مفسدہ کا ہوتا ہے اور اسی سبب سے فقہاء نے لکھا ہے۔ کہ سلطان جائر اگر مسلمان ہو تو اسکو تو خوف قتل میں بھی تبلیغ جائز ہے اور اگر کافر ہو تو اسکو جائز نہیں کیونکہ اول صورت میں فائدہ ہے۔ چونکہ سلطان جائر مسلم ہے۔ اس لئے اُسکے دل پر بعد میں اسکا ضرور اثر ہوگا۔ اور کافر کے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ تو کافر کی تبلیغ میں فائدہ نہ ہوا۔ مسلم کی تبلیغ میں فائدہ ہوا اھ

قولہ جرأت علی اللہ

اس ارشاد سے احقر کا ذہن اس طرف گیا کہ طاعون میں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہاد کے مشابہ ہے کیونکہ شیاطین کا اثر ہے۔ اور وخز من الجن ہے۔ اس لحاظ سے

جہاں پر طاعون ہو وہاں سے فرار حرام ہے۔ اور دوسری حیثیت یہ کہ کفار و عصاۃ کے لئے ایک گونہ عذاب ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں بنی اسرائیل کے لئے طاعون عذاب ہو کر آیا تھا۔ تو اس دوسری حیثیت پر لحاظ کرتے ہوئے جس مقام پر طاعون ہو وہاں جانا صورۃً جرأت علی اللہ ہے۔ کہ حق تعالیٰ کے عذاب کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ حالانکہ موقع عذاب سے دور رہنا اور بچنا مطلوب شرعی ہے۔ چنانچہ عاد و ثمود کے مواقع عذاب میں جانے سے ممانعت ہے۔ اور اگر بضرورت جانا پڑے تو وہاں سے جلدی روتے ہوئے نکل جانا چاہئے ✦ وکذا ورد فی بطن محسر انہ صلی اللہ علیہ وسلم اسرع المرور فیہا واللہ اعلم تو اس سے معلوم ہوا کہ طاعون کے مقام پر نہ جانا جائز۔ نہ وہاں سے بھاگنا جائز (از جامع)

انتھی الملفوظ

تمت بالخیر